مئی

2020ء

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

تمام قارئین کو

ادارہ
لاہور انٹرنیشنل کی جانب سے

رمضان المبارک

اور

پیشگی عید مبارک

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی ومذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

- Company Incorporation / Registered Office Address
- Personal Income Tax Return investigations
- Rental Income Tax Returns
- UK State Pension Entitlement Review
- Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
- UK State Pension / (Contracted Out) Tracing
- Private UK Pension Tracing
- Assets Review for Inheritance Tax
- Appealing - Past years HMRC Penalties
- Preparation / Filing of prior year tax returns
- Duplicate - Payslips / P60s

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK

CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 **FAX** +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM **WEB** WWW.SARMADGLOBAL.COM

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

هُوَالـــــــــــــــنَاصر

بعد از خُدا بعشقِ محمدؐ مخمرم   گر کُفر ایں بود بخُدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 3 شمارہ نمبر 1 جمادی الاوّل 1441 جنوری 2020ء

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

ایڈیٹر
منزہ خان

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
+47-91698367

عرفان احمد خان (جرمنی)
+49-1711974701

ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
+49-15212005548

محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
+41-6433112

ابن الامین (برطانیہ)
+44-7940077825

بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
+92-3327051887

چوہدری مقبول احمد (بھارت)
+91-9988489365

قیمت فی شمارہ: 2 پاؤنڈ

website : lahoreinternational.com

اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com

m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ **لاہور** میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

اس شمارہ میں

04 درسِ قرآن کریم
05 دنیا کرونا وائرس کے باعث معاشی بحران کا شکار
06 جب بھٹو نے جلاد سے کہا 'پھندا کھینچو۔۔ فنش اٹ'
09 کرۂ ارض ضروری مرمت کے لیے بند ہے
10 اقتدار کے دوست اور، اپوزیشن کے دوست اور
12 جونا گڑھ کے پاکستان میں انضمام کا فیصلہ نواب کا نہیں شاہنواز بھٹو کا تھا
14 سقوط حیدرآباد: مسلمان حاکم کی خواہش کے باوجود انڈیا کی یہ ریاست پاکستان کا حصہ کیوں نہ بن سکی؟
18 لفافیت اور میریت
20 سیہون کا گم نام قلعہ
22 پگاڑا سے خان تک
24 انڈین تاریخ میں تیمور لنگ کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے؟
26 وبا کے بعد کی زندگی کیسی ہوگی؟
28 شہنشاہ جارج پنجم کی تعریف میں علامہ اقبال کا قصیدہ
31 مسولینی کی یرغمال سلطنت اور وبا کا سبق
32 کورونا وائرس: سماجی فاصلوں کا دورانیہ بڑھا تو زندگی کیسے تبدیل ہوگی؟
35 محمد بن سلمان کے بادشاہ بننے میں کیا رکاوٹیں ہیں
38 کیا بنی نوع انسان کے لیے یہ آخری صدی ہے؟
40 رمضان المبارک اور اس کی برکات
41 غیر مسلم اور قانون توہینِ رسالت
45 منور احمد کنڈے کی منظومات پر مشتمل تصنیف ''حرفِ منور'' کا پیش لفظ
48 مرزا چپاتی - اردو کے مشہور خاکے
53 اگر میں کہوں کہ یہ تبصرہ نہیں تبصرہ ہوتا ہے تو؟
55 عورت کہانی
57 گھاٹے کے سوداگر
59 پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ کے وائس چانسلر پروفیسر راج کمار کا پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر ڈاکٹر نیاز احمد اختر کے نام خط
61 برطانوی جاسوسوں کو خطرات سے نمٹنے کیلئے آرٹیفیشل انٹیلی جنس کی ضرورت ہوگی
62 بل گیٹس کا چین کے حق میں بیان، امریکا کو آڑے ہاتھوں لے لیا

ADVERTISEMENT TARIFF
(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

درس قرآن کریم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾ قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۲﴾ مَلِکِ النَّاسِ ﴿۳﴾ اِلٰہِ النَّاسِ ﴿۴﴾ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۬ۙ الۡخَنَّاسِ ﴿۵﴾ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ﴿۶﴾ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ﴿۷﴾ (الناس:30)

ترجمہ: اللہ کے نام کے ساتھ جو بے انتہا رحم کرنے والا، بن مانگے دینے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔تُو کہہ دے کہ میں انسانوں کے ربّ کی پناہ مانگتا ہوں۔انسانوں کے بادشاہ کی۔انسانوں کے معبود کی۔بکثرت وسوسے پیدا کرنے والے کے شرّ سے، جو وسوسہ ڈال کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔وہ جو انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔(خواہ) وہ جنوں میں سے ہو (یعنی بڑے لوگوں میں سے) یا عوام الناس میں سے۔

تشریح: یہ سورت یہودیت اور عیسائیت کی ان تمام مجموعی کوششوں کو خلاصۃً پیش کرتی ہے جن کے خدوخال یہ ہوں گے کہ وہ بنی نوع انسان کی ربوبیت کا دعویٰ کریں گے یعنی ان کی اقتصادیات کے بھی مالک بن بیٹھیں گے اور اسی طرح ملوکیت کا بھی دعویٰ کریں گے یعنی ان کی سیاست پر قبضہ کرلیں گے۔اور پھر گویا خود معبود بن جائیں گے اور جواُن کی عبادت کرے اس کو تو وہ عطا کریں گے اور جواُن کی عبادت کا انکار کرے اس کو وہ رُسوا کردیں گے۔

اُن کا سب سے خطرناک ہتھیار یہ ہوگا کہ ایسے وسوسے پیدا کرنے والے کی طرح ہوں گے جو خنّاس ہوگا یعنی دلوں میں وسوسہ پیدا کرکے پھر آپ غائب ہوجائیں گے۔یہی حال اس زمانہ کی بڑی طاقتوں یعنی Capitalism کا بھی ہوگا اور عوامی طاقتوں یعنی اشتراکیت (Communism) کا بھی ہوگا۔پس جو ان تمام امور سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آئے گا اللہ تعالیٰ اسے بچالے گا۔ (ترجمہ حضرت مرزا طاہر احمدؒ صفحہ 1230-1231)

علاوہ ازیں اسی سورہ کی تشریح بیان کرتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ فرماتے ہیں۔

امراض سینے کا علاج: میں خیال کرتا ہوں کے امراض سینہ مثلاً سِل، کھانسی وغیرہ کے واسطے اس سورہ شریفہ میں ایک دعا ہے۔کیونکہ آجکل ڈاکٹروں نے یہ تحقیقات کی ہے کہ پھیپھڑے میں ایک باریک کیڑے ہوتے ہیں جن کو جرمز کہتے ہیں۔جب وہ پیدا ہوجاتے ہیں تب پھیپھڑا زخمی ہوکر سِل کی بیماری اور کھانسی پیدا ہوجاتی ہے۔جنّ بھی ایک باریک اور مخفی شئے کو کہتے ہیں۔اس سورۃ میں ان اشیاء کے شر سے پناہ چاہی گئی ہے۔جو سینہ کے اندر ایک خرابی پیدا کرتے ہیں۔ناظرین اس کا تجربہ کریں۔لیکن صرف جنتر منتر کی طرح ایک دعا کا پڑھنا اور پھونک دینا بے فائدہ ہے، سچے دل کے ساتھ اور معنی کو یہ سورۃ بطور دعا کے مریض اور اس کے معالج اور تیماردار پڑھیں اور مریض کے حق میں دعا کریں تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور بخشنے والا ہے۔میں اُمید کرتا ہوں کہ ایسے بیماروں کو اس کلام پاک کے ذریعہ شفا حاصل ہو۔**واللہ اعلم بالصواب۔**

اس سورۃ شریفہ کے شانِ نزول کے بارہ میں حدیث شریف میں آیا ہے۔کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ آج کی رات مجھ پر اس قسم کی آیات نازل ہوئیں کہ ان جیسی میں نے کبھی نہیں دیکھیں وہ معوذتین ہیں۔ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جنّ وانس کی نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے،مگر جب معوذتین نازل ہوئیں تو آپؐ نے اور طرح اس امر سے متعلق دعا کرنا چھوڑ دیا اور ہمیشہ ان الفاظ میں دعا مانگتے تھے۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوا کرتے تو ان دونوں سورتوں کو پڑھ پڑھ کر دم کیا کرتے تھے۔

(حقائق الفرقان جلد چہارم صفحہ 587)

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

ادار یہ

دنیا کرونا وائرس کے باعث معاشی بحران کا شکار

کرونا وائرس نے پوری دنیا کی ترقی، معیشت طشت از بام کردی ہے۔ یورپ کیا تمام بڑی طاقتیں اس کے آگے بے بس دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بات اب بظاہر نظر آرہی ہے کہ کوئی ملک کسی آسمانی وزمینی آفت یا وباء سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔اس وائرس نے جہاں ترقی یافتہ ممالک کی معیشت کو بُری طرح متاثر کیا ہے وہیں ترقی پذیر ممالک بھی اس کی زد میں ہیں۔راقم الحروف کا پچھلا آرٹیکل آسمانی وزمینی آفات سے متعلق سائنسدانوں اور ماہرین کا تجزیہ جو چند صدیوں پر مشتمل تھا پیش کیا۔آج اس وائرس سے متعلق دنیا کی معیشت کس حدتک متاثر ہوگی مختصراً یہ ہے۔

اس وائرس سے نمٹنے کے لئے دنیا بھر میں سرکاری ونجی ادارے بند ہیں ان کی عمومی سرگرمیاں محدود کردی گئی ہیں۔اس کی وجہ سے ملازمتی مواقع بند ہیں اور معاشی دباؤ کا شکار وہ ممالک جو بیرونی امداد پر کامل بھروسہ کرتے ہیں بُری طرح متاثر ہیں۔ترقی پذیر ممالک کی صنعتوں اور دیگر نجی اداروں نے اپنے ملازمین کو فارغ کردیا ہے چونکہ ان کی صنعتوں نے مال بنانا بند کردیا ہے۔اس طرح زراعت کا شعبہ بھی بُری طرح متاثر ہورہا ہے۔امریکہ کے فارمروں نے لاکھوں ٹن دودھ ضائع کردیا۔لاک ڈااؤن کی وجہ سے یہ ایک معمولی مثال ہے۔کھانے پینے روزمرہ استعمال زندگی کی کمی واقع ہونے کی وجہ سے جو حالات آئندہ پیش آنے والے ہیں وہ کسی حدتک دنیا کے لئے خطرناک ثابت ہوں گے۔ بے سہارا، بے روزگار افراد جو روزانہ کی بنیاد پر کمانے کے لئے گھروں سے نکلا کرتے ہیں آج وہ سب بے سہارا کسی کارکن کی راہ تک رہے ہوتے ہیں۔ پاکستان میں تو ذرائع یہ بتاتے ہیں کہ اس سے ہر ماہ 2 کروڑ افراد متاثر ہوں گے۔ذرائع وتجزیاتی رپورٹ کے مطابق لاک ڈاؤن کے طویل ہونے کی وجہ سے دنیا میں معاشی بحران پیدا ہوجائے گا۔ عالمی خوراک کے ادارے نے کہا ہے کہ آنے والے دنوں میں کرونا وائرس کے مزید تکلیف دہ اثرات ظاہر ہونے کے خدشات موجود ہیں۔ورلڈ فوڈ پروگرام کے ڈائریکٹر ڈیوڈ بیسکی نے CBN نیوز چینل سے بات کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کو آنے والے دنوں میں انسانی ہمدردی کے شدید بحران کا سامنا ہوسکتا ہے۔اور تین درجن ملکوں میں قحط پڑسکتا ہے۔مزید یہ کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سب سے شدید بحران ہوگا۔اس لئے کہ وائرس کی وجہ سے بندرگاہیں بند پڑی ہیں اور رسد کا نظام درہم برہم ہوچکا ہے۔جس کی وجہ سے کئی علاقوں میں خوراک کی قلت پیدا ہورہی ہے۔ عالمی ادارہ صحت نے انتباہ کیا ہے کہ براعظم افریقہ کے دیہی علاقوں میں وباء تیزی سے پھیل رہی ہے جس کی وجہ سے طبی سہولیات کے علاوہ خوراک اور معاشی بحران کا شکار ہوجائے گا۔ عالمی مالیاتی ادارہ (IMF) نے پیش گوئی کی ہے کہ 1930ء کی دہائی کے بعد کرونا وائرس کی وجہ سے عالمی معیشت کے لئے یہ سال بدترین ثابت ہوگا۔ان کا مزید کہنا ہے کہ عالمی معیشت کے تین فیصد سکڑنے کا امکان ہے جو کہ 2009ء کی کساد بازاری کے مقابلے میں جو صفر اعشاریہ ایک تھی بہت زیادہ ہے۔اس صورتحال کے پیش نظر توقع کی جارہی ہے کہ 2021ء میں عالمی معیشت کی شرح نمو 5اعشاریہ 8 ہوگی اس طرح آئندہ سال معیشت کے دوبارہ بحال ہونے کے امکانات بے یقینی کا شکار ہیں۔IMF کے ایک اہم عہدیدار کا کہنا ہے کہ عالمی گراس گھریلو اشیاء کو پہنچنے والے نقصانات کا تخمینہ 9 ٹریلین ڈالر تک ہوسکتا ہے۔ جو کہ جرمنی اور جاپان کی معیشتوں سے زیادہ ہے۔جی ڈی پی کسی بھی معاشی آؤٹ پٹ کا وسیع تر احاطہ کرتی ہے۔اپنی تازہ ترین رپورٹ میں عالمی مالیاتی ادارے نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اس سال امریکہ کی معیشت 5اعشاریہ 9 فیصد سکڑے گی جبکہ یورو کرنسی استعمال کرنے والی 19 یورپین ممالک کی معیشت 7اعشاریہ 5 فیصد۔ جاپان 5اعشاریہ 2 اور برطانیہ کی معیشت 6اعشاریہ 5 فیصد کمی ہوگی دوسرے ملکوں کی بنسبت دنیا کی دوسری سب سے بڑی معیشت چین نے دیگر ملکوں کے مقابلے میں بہت پہلے اپنی معاشی سرگرمیوں کا آغاز کردیا ہے۔IMF نے گزشتہ دنوں متنبہ کیا تھا کہ دنیا کو 1930ء کی کساد بازاری کے بعد بدترین کساد بازاری کا سامنا ہوگا ان کا کہنا تھا کہ افریقہ، لاطینی امریکہ اور زیادہ تر ایشیاء کی اُبھرتی ہوئی منڈیاں بدترین اور کم آمدن والے ممالک کو سب سے زیادہ خطرہ ہے۔اس لئے IMF نے 25 فیصد غریب ممالک کے ذمہ واجب الادا 5 سوملین ڈالر کے قرضوں کی ادائیگی میں 6 ماہ کی توسیع کی ہے۔

آج پاکستان سمیت ساری دنیا کا سامنا کرونا جیسی آفت وباء سے ہورہا ہے۔ یہ خطرناک صورت اختیار کررہا ہے چونکہ ابھی تک اس کا علاج دریافت نہیں ہوا اور کسی کو پتہ نہیں یہ کب ختم ہوگا یا کچھ اس کے جراثیم باقی رہ جائیں گے۔ساری دنیا میں ایک لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوچکے ہیں اور لاکھوں متاثر۔اس وباء نے ہماری تمام مذہبی اور سوشل تقریبات پامال کردی ہیں۔ہم تو اپنے پیاروں کو کندھا بھی نہیں سکتے ایسی صورتحال آج تک دیکھنے کو نہیں ملی۔

آج ہر مذہبی لیڈر یہی کہہ رہا ہے کہ یہ عذاب الٰہی ہے۔ پاکستانی قوم نے تو مفتی طارق جمیل کی امامت میں توبہ استغفار کے لئے دعا بھی کروادی اور اس میں ساری قوم کو قصوروار ٹھہرا دیا۔جو فسق وفجور پھیلا رہے ہیں۔ یادرہے حضرت عمر فاروقؓ کے ابتدائی 5 سال قحط کے تھے۔ایسے حالات افراد یا اقوام کی زندگیوں میں آزمائش آتی رہتی ہیں۔ایسے واقعات آتے ہیں تو ہر ایک کا انداز فکر مختلف ہوتا ہے یادرہے ہر انسان کو دنیا میں ہی آزمایا جائے گا اور اس دنیا میں حساب دیئے بغیر اُٹھایا نہیں جائے گا۔یہی قرآنی تعلیم ہے۔زردار (صاحب ثروت) بادشاہ تو کیا خدا کے پیارے بندوں کو بھی استثنیٰ نہیں۔تمام انسانوں کو چاہئے قرآنی تعلیمات اور اسوۂ رسول کریمؐ اور وقت کے امام کی طرف رجوع کریں تاکہ اللہ آپ سے راضی ہو اور تمام آفات سے آپ کو پاک کردے۔آمین

جب بھٹو نے جلاد سے کہا ’پھندا کھینچو۔۔۔ فنش اٹ‘

تحریر: ریحان فضل

4 اپریل 1979 کو ذوالفقار علی بھٹو کو رات دو بجے راولپنڈی کی سینٹرل جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

ان کو راولپنڈی جیل کے زنانے حصے میں ایک سات بائی دس فٹ کی کوٹھری میں قید کیا گیا تھا۔

بھٹو کو ایک پلنگ، گدا، چھوٹی سی میز، اور ایک بک شیلف دی گئی تھی۔ بغل میں ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جہاں ان کے لیے ایک قیدی کھانا بناتا تھا۔

ہر دس دن بعد وہ قیدی بدل دیا جاتا تھا تاکہ اس کو بھٹو سے انسیت نہ ہو جائے۔ کبھی کبھی بھٹو کے دوست اور دانتوں کے مشہور ڈاکٹر، ڈاکٹر نیازی ان کے لیے کھانا بھیجا کرتے تھے۔

بھٹو کی زندگی پر کتاب لکھنے والے مصنف سلمان تاثیر جن کا بعد میں قتل کر دیا گیا، اپنی کتاب ’بھٹو‘ میں لکھتے ہیں ’شروع کے دنوں میں بھٹو جب بیت الخلا جاتے تھے تو ایک سیکورٹی گارڈ وہاں بھی ان کی نگرانی کرتا تھا۔ بھٹو کو یہ بات اتنی ناپسند تھی کہ انھوں نے تقریباً کھانا کھانا بند کر دیا تھا تاکہ انہیں بیت الخلا جانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ کچھ دن بعد اس طرح کی سخت نگرانی بند کر دی گئی تھی اور ان کے لیے کوٹھری کے باہر علیحدہ ایک بیت الخلا بنوا دیا گیا تھا۔‘

بھٹو کو جیل کے اندر پڑھنے کی آزادی تھی۔ آخری دنوں میں وہ چارلس ملر کی ’خیبر‘، رچرڈ نکسن کی سوانح عمری، جواہر لال نہرو کی ’ڈسکوری آف انڈیا‘ اور صدیق سالک کی ’وٹنیس ٹو سرنڈر‘ کا مطالعہ کر رہے تھے۔

پنجاب حکومت کے جلاد تارا مسیح کو بھٹو کو پھانسی دینے کے لیے لاہور سے بلایا گیا تھا۔ ان کا یہ کام پشتینی پیشہ تھا۔ ان کا خاندان مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے سے پھانسی دینے کا کام کر رہا تھا۔

اس وقت مسیح کی تنخواہ 375 روپے ماہانہ تھی اور ہر پھانسی دینے پر انہیں اضافی 10 روپے ملتے تھے۔

جیل میں رہتے ہوئے بھٹو مسلسل اپنے مسوڑھوں میں درد سے بے حد پریشان تھے۔ ان میں پس بھی پڑ گئی تھی۔

بھٹو کو لگتا تھا کہ انہیں پھانسی نہیں ہو سکتی

ایک بار جب جیل کے اندر ڈاکٹر نیازی ایک لالٹین کی روشنی میں ان کے دانتوں کا معائنہ کر رہے تھے تو بھٹو نے ان کے ساتھ مذاق کیا ’تم بھی میری طرح سے بدقسمت ہو، تمھارے کلینک میں ایک حسین لڑکی تمہاری مدد کر رہی ہوتی ہے اور یہاں مدد کرنے کے لیے ایک قیدی ملا ہے۔‘

بے نظیر بھٹو 2 اپریل 1979 کی صبح اپنے بستر میں لیٹی ہوئی تھیں تبھی اچانک ان کی والدہ نصرت بھٹو کمرے میں یہ کہتے ہوئے داخل ہوئیں ’پنکی، گھر کے باہر جو فوجی ہیں وہ کہہ رہے ہیں ہم دونوں کو آج ہی تمہارے والد سے ملاقات کرنے جانا پڑے گا، اس کا مطلب کیا ہے؟‘

بے نظیر اپنی سوانح عمری ’ڈاٹر آف دا ایسٹ‘ میں لکھتی ہیں ’مجھے معلوم تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میری والدہ کو بھی معلوم تھا۔ لیکن ہم دونوں اس کو قبول نہیں کر پا رہے تھے۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ضیا الحق میرے والد کا قتل کرنے کو تیار تھے۔‘

نصرت اور بے نظیر بھٹو کو ایک شیور لیٹ کار میں راولپنڈی جیل لایا گیا۔ تلاشی کے بعد انہیں بھٹو کے سامنے لے جایا گیا۔ ان کے درمیان پانچ فٹ کی دوری

رکھی گئی۔

بے نظیر لکھتی ہیں 'میرے والد نے پوچھا تھا کہ گھر والوں سے ملاقات کے لیے انہیں کتنا وقت دیا گیا ہے؟ جواب آیا آدھا گھنٹہ۔ میرے والد نے کہا کہ لیکن جیل کے قوانین کے مطابق پھانسی سے پہلے خاندان والوں سے ملاقات کے لیے ایک گھنٹہ ملتا ہے لیکن اہلکار نے جواب دیا کہ مجھے ایسی ہی ہدایت موصول ہوئی ہیں کہ آپ کو صرف آدھا گھنٹہ دیا جائے۔ وہ زمین پر ایک گدے پر بیٹھے تھے کیونکہ ان کی کوٹھڑی سے میز، کرسی اور پلنگ ہٹا دیے گئے تھے۔'

بے نظیر مزید لکھتی ہیں 'انہوں نے میری لائی ہوئی کتابیں اور میگزین مجھے واپس کر دیں۔'

'میرے والد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے مرنے کے بعد وہ لوگ انہیں ہاتھ لگائیں۔ انہوں نے مجھے ان کے وکیل کے دیے ہوئے کچھ سگار بھی واپس کیے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ شام کے لیے میں نے ایک سگار بچا کر رکھا ہے۔ انہوں نے شالیمار کولون کی ایک شیشی بھی اپنے پاس رکھی تھی۔ وہ مجھے اپنی شادی کی انگوٹھی دے رہے تھے، لیکن میری والدہ نے انہیں روک دیا۔ اس پر انہوں نے کہا 'ابھی تو میں اسے پہن لیتا ہوں لیکن بعد میں اسے بے نظیر کو دے دیا جائے۔'

تھوڑی دیر بعد جیلر نے آ کر کہا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

بے نظیر نے کہا کہ کوٹھڑی کو کھولیے 'میں اپنے والد کو گلے لگانا چاہتی ہوں لیکن جیلر نے اس کی اجازت نہیں دی۔'

بے نظیر مزید لکھتی ہیں 'میں نے کہا، پلیز میرے والد پاکستان کے منتخب وزیر اعظم ہیں اور میں ان کی بیٹی ہوں۔ یہ میری آخری ملاقات ہے اور مجھے ان کو گلے لگانے کا حق ہے۔ لیکن جیلر نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے کہا گڈ بائے پاپا۔ میری والدہ نے سلاخوں کے درمیان ہاتھ بڑھا کر میرے والد کے ہاتھ کو چھوا۔ ہم دونوں تیزی سے باہر کی جانب نکلے۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتی تھی لیکن میری ہمت جواب دے گئی۔'

جیل سپرنٹنڈنٹ یار محمد نے انہیں کالا وارنٹ پڑھ کر سنایا جسے انہوں نے چپ چاپ سنا۔ بھٹو نے کوٹھڑی کے باہر کھڑے گارڈ کو بلایا اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ مرنے کے بعد میری گھڑی اس کو دے دی جائے۔

آٹھ بج کر پانچ منٹ پر بھٹو نے اپنے ہیلپر عبدالرحمن سے کافی لانے کے لیے کہا۔ انہوں نے رحمان سے کہا کہ اگر میں نے تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی کی ہو تو اس کے لیے مجھے معاف کر دینا۔

سپریم کورٹ کی جانب سے ان کی رحم کی اپیل مسترد کیے جانے کے بعد ان کا ریزر اس لیے واپس لے لیا گیا تھا کہ کہیں وہ اس سے خودکشی نہ کر لیں۔

سلمان تاثیر لکھتے ہیں 'بھٹو نے کہا، مجھے داڑھی بنانے کی اجازت دی جائے، میں مولوی کی طرح اس دنیا سے نہیں جانا چاہتا۔'

نو بج کر 55 منٹ پر انہوں نے اپنے دانتوں میں برش کیا، چہرہ دھویا، اور بال بنائے۔ اس کے بعد وہ سونے چلے گئے۔ رات ڈیڑھ بجے انہیں اٹھایا گیا۔ وہ ہلکے بادامی رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے۔ جیل اہلکاروں نے کپڑے تبدیل کرنے پر زور نہیں دیا۔

جب سیکورٹی اہلکاروں نے ان کے ہاتھ پیچھے باندھنے کی کوشش کی تو انہوں نے اس کی مخالفت کی۔

آخر کار انہوں نے زبردستی ان کے ہاتھ رسی سے باندھ دیے۔ اس کے بعد انہیں ایک سٹریچر پر لٹا کر تقریباً 40 گز کی دوری تک لے جایا گیا۔

سلمان تاثیر مزید لکھتے ہیں 'اس کے بعد بھٹو سٹریچر سے خود اتر گئے اور پھانسی کے پھندے تک خود چل کر گئے۔ جلاد نے ان کا چہرہ کالے کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ ان کے پیر باندھ دیے گئے۔ جیسے ہی دو بج کر چار منٹ پر مجسٹریٹ بشیر احمد خان نے اشارہ کیا، جلاد تارا مسیح نے لیور کھینچا۔ بھٹو کے آخری الفاظ تھے 'فنش اٹ'۔'

35 منٹ بعد بھٹو کے مردہ جسم کو ایک سٹریچر پر رکھ دیا گیا۔

اس زمانے میں راولپنڈی سینٹرل جیل میں خفیہ اہلکار رہے کرنل رفیع الدین

اپنی کتاب 'بھٹو کے آخری 223 دن' میں لکھتے ہیں 'تھوڑی دیر بعد ایک خفیہ ایجنسی کے ایک فوٹوگرافر نے آ کر بھٹو کے پرائیوٹ پارٹس کی فوٹو اتاریں۔ حکومت اس بات کی تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ آیا بھٹو کی اسلامی طریقے سے ختنے بھی ہوئے تھے یا نہیں۔ تصاویر اتارنے کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ بھٹو کے ختنے ہوئے تھے۔'

بعد میں شیام بھاٹیہ نے اپنی کتاب 'گڈبائی شہزادی' میں لکھا تھا کہ بے نظیر نے انہیں خود بتایا تھا کہ بھٹو کو موت کے بعد بھی اس بے عزتی سے گزرنا پڑا تھا۔

بے نظیر اپنی سوانح عمری میں لکھتی ہیں 'ممی کی دی ہوئی نیند کی وولیم گولیوں کے باوجود ٹھیک دو بجے میری آنکھ کھل گئی اور میں زور سے چلائی۔ نو۔ نو۔۔ میری سانس رک رہی تھی۔ جیسے کسی نے میرے گلے میں پھندا پہنا دیا ہو۔ پاپا، پاپا۔ میرے منہ سے بس یہی نکل رہا تھا۔ سخت گرمی کے باوجود میرا پورا جسم کانپ رہا تھا۔'

چند گھنٹوں کے بعد سینٹرل جیل کے اسسٹنٹ جیلر اس گھر میں گئے جہاں نصرت اور بے نظیر بھٹو کو نظر بند کیا گیا تھا۔

اسے ملتے ہی بے نظیر کے پہلے الفاظ تھے 'ہم وزیر اعظم کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں۔'

جیلر کا جواب تھا 'انہیں تدفین کے لیے لے جایا جا چکا ہے۔'

بے نظیر لکھتی ہیں 'مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے گھونسا مارا ہو۔ میں نے چلا کر کہا آپ انہیں ان کے اہل خانے کے بغیر تدفین کے لیے کیسے لے جا سکتے ہیں؟'

اس کے بعد اس جیلر نے بھٹو کی ایک چیز بے نظیر کو سونپی۔

بے نظیر لکھتی ہیں 'اس نے مجھے پاپا کی شلوار قمیض دی جو پاپا نے مرنے سے پہلے پہن رکھی تھی۔ اس سے شالیمار کولون کی مہک ابھی تک آ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک ٹفن باکس دی جس میں انہیں گزشتہ دس دنوں سے کھانا بھیجا جا رہا تھا جسے وہ کھا نہیں رہے تھے۔ اس نے ان کا بستر اور چائے کا کپ بھی مجھے دیا۔ میں نے پوچھا ان کی انگوٹھی کہاں ہے؟ جیلر نے پوچھا ان کے پاس انگوٹھی بھی تھی کیا؟ پھر اس نے جھولے میں سے انگوٹھی تلاش کرنے کا ڈرامہ کیا اور پھر انگوٹھی مجھے پکڑا دی۔ وہ جیلر بار بار کہہ رہا تھا کہ ان کی آخرت بہت پر سکون تھی۔' میں نے سوچا پھانسی بھی کیا کبھی پُرسکون ہو سکتی ہے۔

بے نظیر کے خاندان کے ملازم بشیر کی نگاہ جیسے ہی بھٹو کے شلوار قمیض پر پڑی، وہ چلانے لگا۔ 'یا اللہ، یا اللہ، انھوں نے ہمارے صاحب کو مار دیا۔'

(بشکریہ بی بی سی)

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے" لاہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہوگی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کرواسکتے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26

Lahore International Magazine
Instagram: @lahoreintl
Twitter: @lahoreintl
Facebook: lahoreinternational
YouTube: lahoreinternational
Google+: lahoreintl
Contact: +447940077825
Whatsapp: +447940077825
Email: lahoreintlondon@gmail.com

کرۂ ارض ضروری مرمت کے لیے بند ہے

تحریر: وسعت اللہ خان

یہ کھیل سلویٰ کو اس کے والد عبداللہ المحمد نے دو برس پہلے چھوٹی عید پر سکھایا، جب گلی میں بچے عید کی خوشی میں پٹاخے چلا رہے تھے اور ایک برس کی سلویٰ ڈر رہی تھی۔

سلویٰ اس وقت تین سال کی ہے، اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ پناہ گزیں ہے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔ اسے بس یہ سکھایا گیا ہے کہ دھماکے کی آواز سن کر روتے نہیں ہنستے ہیں۔ کیونکہ دھماکہ ایک کھیل ہے اور کھیل ڈرنے کے لیے نہیں بلکہ انجوائے کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ جتنا شدید دھماکہ ہو اتنا ہی زور سے ہنسنا چاہیے۔

یہ کھیل سلویٰ کو اس کے والد عبداللہ المحمد نے دو برس پہلے چھوٹی عید پر سکھایا، جب گلی میں بچے عید کی خوشی میں پٹاخے چلا رہے تھے اور ایک برس کی سلویٰ ڈر رہی تھی۔

عبداللہ کو خیال آیا کہ یہاں تو ہر وقت طرح طرح کے دھماکوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں، تو کیا سلویٰ مسلسل ڈرے گی اور نفسیاتی مریض بن جائے گی۔

چنانچہ عبداللہ نے اپنی بیٹی کے لیے ڈر اور خوشی کے معنی ہی بدل دیے یعنی دھماکے کا مطلب ہے بچوں کا کھیل اور کھیل کا مطلب ہے خوشی۔ جتنا بڑا دھماکہ اتنا بڑا قہقہہ۔

مگر اب سلویٰ تین سال کی ہو گئی ہے۔ اسے ہوائی جہاز کی آواز اور پٹاخے، بم اور میزائیل کے دھماکے کی آواز میں فرق کرنا آ گیا ہے۔ اس فرق نے اس کے اندر دوبارہ ہلکا ہلکا ڈر پیدا کر دیا ہے۔ مگر اسے اور اس کے باپ کو پچھلے دو برس میں ہنسنے کی اتنی عادت پڑ چکی ہے کہ دھماکہ سنتے ہی دونوں خود بخود ہنس پڑتے ہیں اور ایک دوسرے سے اپنا ڈر چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب دھماکہ کہیں بہت ہی قریب یا اس کی آواز ناقابلِ برداشت ہو تو ننھی سلویٰ سہم کے چپ ہو جاتی ہے۔ پھر اچانک اسے خیال آتا ہے ارے اس پر تو ہنسنا ہوتا ہے اور اسے یکدم قہقہہ لگانے کا سبق یاد آ جاتا ہے۔

سلویٰ کے والد کا کہنا ہے کہ شاید ایک آدھ برس میں سلویٰ کو یہ ڈرامہ پوری طرح سمجھ میں آ جائے گا۔ شاید اس کے بعد وہ قہقہے لگانا چھوڑ دے مگر جب تک ہم اسے اندرونی ٹوٹ پھوٹ سے بچا سکتے ہیں تب تک تو پوری کوشش کریں گے۔ ہم نو برس سے دنیا کو پیغام دے رہے ہیں کہ ہمیں بچا لو مگر اب ہم تھک چکے ہیں۔ ہم اپنے بچوں کے لیے ایک زندگی کے سوا کچھ نہیں مانگ رہے۔ کیا یہ بہت بڑا مطالبہ ہے؟

سلویٰ اپنے والد والدہ کے ساتھ شام کے محاصرہ زدہ شہر ادلب میں تھی جب دو ہفتے پہلے اس کی قہقہے لگانے والی ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی۔

ادلب آج بھی مسلسل روسی اور شامی فضائیہ کی بمباری اور محاصرے کی زد میں ہے۔ اب تک اس علاقے سے نو لاکھ افراد اگلی پناہ کی تلاش میں نکل چکے ہیں۔ معلوم نہیں سلویٰ اور اس کے والدین بھی اس ایک اور ہجرت کا حصہ ہیں یا ابھی تک ادلب میں موجود ہیں اور زندہ ہیں اور ہر دھماکے پر قہقہے لگا رہے ہیں۔

دھماکوں کو دلچسپ کھیل سمجھ کے قہقہے لگانے کی اس تربیتی ویڈیو سے پتہ چلتا ہے کہ آج کے دور میں المیہ اور طربیہ کے معنی بدل چکے ہیں۔ انسان کی بے بسی اور خود مختاری کی حدود دھندلا چکی ہیں، جبلت اور جبر کی حدود خلط ملط ہو گئی ہیں۔ زندگی میں موت کے انتظار کے سوا بھی بہت کچھ ہے پر شاید اب یہ بات بھی پرانی ہو رہی ہے۔

شاید کچھ عرصے پہلے تک انسان کے پاس خوش رہنے یا ڈرنے، ہنسنے یا رونے کا تھوڑا بہت اختیار تھا، شاید وہ بھی چھن گیا ہے۔ اب بس ایک ہی راستہ ہے۔ تین سالہ سلویٰ اور اس کے والد کی طرح ہر حال میں خوش رہنے کی اداکاری کرنا۔ اگر زندگی یہی ہے تو پھر موت کیا ہے؟

میرے دوست اور سینیئر ساتھی شاہد ملک کو جب لگ بھگ دس برس بعد بی بی سی لندن سے لاہور ٹرانسفر کیا گیا تو سال بھر بعد میری ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ پوچھا ملک صاحب کیا آپ لاہور کے عادی ہو گئے ہیں یا ہو رہے ہیں؟

ملک صاحب نے فرمایا کہ بس شروع کا ایک ہفتہ لگا اس نتیجے پر پہنچنے میں کہ ذرا سی بے حسی سیکھنی ہے، گاڑی کے شیشے بند رکھنے ہیں اور ہر بات پر ہنس پڑنا ہے۔ اس کے بعد سے زندگی بہت اعلیٰ ہو گئی ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ پچھلے ڈیڑھ برس سے بالخصوص ہم سب کے پاس سوائے قہقہوں کے انجکشن لگا کے ٹائم پاس کرنے کے کوئی آپشن ہی نہیں بچا۔

آج کا دن بھی عیش سے گزرا
سر سے پا تک بدن سلامت ہے (جون ایلیا)

اقتدار کے دوست اور، اپوزیشن کے دوست اور

تحریر: سہیل وڑائچ

دونوں خان پٹھان، جہانگیر ترین پٹھان اور عمران نیازی پٹھان،

گو دونوں نسلی طور پر پٹھان ضرور ہیں مگر ان کے خاندان صدیوں سے پنجاب میں آباد ہیں، سو دونوں ہی پنجابی پٹھان ہیں۔

دونوں کے والد سرکاری ملازم تھے سو دونوں کے بچپن تقریباً ایک ہی طرح گزرے ہونگے۔

ترین کے والد اللہ نواز ترین پولیس میں تھے اور عمران کے والد سرکاری محکمے میں سول انجینئر تھے۔

ترین اور عمران دونوں کا پہلا کیریئر سیاست نہیں تھا، ترین بینکر اور عمران کرکٹر تھے۔

دونوں نے بعد میں سیاست کے کیریئر کا انتخاب کیا۔

دونوں نے زندگی کا آغاز مڈل کلاس شہری کی حیثیت سے کیا، پھر دونوں دولت کما کر اشرافیہ میں داخل ہوئے۔

ترین صنعت کاری اور زمینداری سے امیر ہوئے جبکہ عمران نے صرف کرکٹ سے کمائی کی۔

جہانگیر خان ترین کے کزن ہمایوں اختر خان اور ان کے برادر نسبتی مخدوم احمد محمود پہلے سے سیاست میں متحرک تھے۔ مخدوم احمد محمود جہانگیر ترین کو کھینچ کر سیاست میں لائے۔

اسی طرح عمران خان کے کزن اور برادر نسبتی حفیظ اللہ نیازی اسلامی جمعیت طلبہ میں سرگرم تھے وہ عمران کو سیاست کے میدان میں کھینچ کر لانے والوں میں سرفہرست تھے۔

مشترکات کی ایک لمبی فہرست کے بعد اب دونوں کے تضادات کی طرف چلتے ہیں۔

عمران خان نے کبھی بزنس نہیں کیا اور کرکٹ کے بعد سے پیسے کمانے کی بجائے فلاح انسانی کا فریضہ سنبھال لیا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ مادی دنیا کی بجائے روحانی دنیا سے جڑتے گئے۔

دوسری طرف جہانگیر خان ترین مادی دنیا میں ایک سے دوسری منزل فتح کرتے گئے، ایک مل کے بعد دوسری اور صنعت کے بعد زراعت میں بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑتے گئے۔

سیاست میں ترین اور خان اکٹھے ہوئے تو یہ ایک خوفناک اور خطرناک 'جوڑا' بن گئے۔

عمران خان اخلاقیات کا جھنڈا اٹھائے قیادت کرتے رہے اور جہانگیر خان عملیت پسندی پر عمل کرتے ہوئے انتخابی گھوڑوں پر ہاتھ ڈالتے گئے۔ عمران خان سٹیج پر کھڑے ہو کر سیاسی لتے لیتے اور جہانگیر ترین رات کے اندھیروں میں جا کر سیاسی مخالفوں کو توڑتے۔

عمران خان ن لیگ کے خلاف عدالتوں میں مقدمات کرتے اور جہانگیر خان ترین ان مقدمات کے لیے فائلوں کا پیٹ بھرتے غرض یہ کہ اس خطرناک جوڑے نے مخالف سیاست کو تاراج کر دیا۔

تحریک انصاف کی سیاسی، عدالتی اور قانونی فتح کا راستہ ان دونوں کی مشترکہ ٹیم سے ہی ممکن ہوا تھا۔

چینی سکینڈل کی رپورٹ کے بعد گذشتہ روز ایک انٹرویو میں جہانگیر خان ترین نے کہا کہ اب وہ اور عمران خان اتنے قریبی دوست نہیں رہے لیکن چند سال پہلے تک ان کی دوستی بہت گہری ہوتی تھی۔

اس قدر گہری کہ عمران خان اپنے نجی معاملات پر بھی ترین سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

ریحام خان نے اپنی کتاب اور انٹرویو میں انکشاف کیا تھا کہ عمران خان مجھ سے طلاق لینے پر ترین سے مشورہ کر رہے تھے کہ میں نے خود سن لیا اور دروازہ کھول کر انھیں بتا بھی دیا کہ میں آپ کی باتیں سن چکی ہوں بعد ازاں جہانگیر خان ترین نے بھی اعتراف کیا کہ یہ بات سچ تھی۔

نجی معاملات کے ساتھ ساتھ سیاسی حوالے سے بھی جہانگیر خان ترین کا پارٹی اور بنی گالہ پر مکمل 'ہولڈ' تھا۔

تحریک انصاف میں کس نے اوپر جانا ہے اور کون فارغ ہوگا، اس کا مکمل دارومدار جہانگیر خان ترین کی حکمت عملی پر ہوتا تھا۔

الیکشن سے پہلے تک بنی گالہ عون چودھری، پنجاب علیم خان اور پختونخواہ پرویز خٹک کے مکمل قبضے میں تھے اور تینوں جہانگیر ترین کی مُٹھی میں تھے مگر پھر سب کچھ بدلنا شروع ہوگیا۔

صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ اقتدار کے دوست اور ہوتے ہیں اور اپوزیشن کے دوست اور۔ بالکل ایسا ہی جہانگیر ترین کے ساتھ بھی ہوا۔ عدالت عظمیٰ نے انہیں سیاست سے نااہل اور عمران خان کو اہل قرار دیکر ایک عملیت پسندانہ سیاسی لین دین کا فیصلہ کیا جس پر تحریک انصاف سمیت کوئی بھی انگلی نہ اٹھا سکا اور یوں عمران خان کے نمبر 2 کا ڈھلوان کی طرف سفر شروع ہوا۔

اقتدار ملنے سے پہلے عمران کی بشریٰ وٹو سے شادی ہوگئی اور اقتدار ملتے ہی عون چودھری کی بنی گالہ سے چھٹی ہوگئی۔

علیم خان اپنے چارٹر جہاز پر عمران اور ان کی بیگم کو عمرے کے لیے لے گئے مگر وہاں کیا ہوا کہ علیم خان بیگم صاحبہ کی نظروں میں سما نہ سکے اور پھر رفتہ رفتہ وہ بھی دور ہوتے گئے۔

پرویز خٹک دوبارہ وزیر اعلیٰ پختونخواہ نہ بن سکے، وفاقی وزیر بن گئے مگر اب بھی ناپسندیدہ لوگوں میں شامل ہیں۔ اقتدار کے چند ہی ماہ میں جہانگیر ترین کا قریبی حلقہ اثر عمران سے دور ہوتا گیا یا دور کر دیا گیا۔

ترین اور عمران میں فاصلے بڑھنے لگے مگر جب بھی کوئی بڑا معاملہ ہوتا کسی پارٹی سے ڈائیلاگ یا اتحاد کی بات ہوتی تو جہانگیر ترین کو بلایا جاتا۔ مگر پھر وقفے بڑھتے گئے، اس دوران عمران کی نئی کچن کابینہ بن گئی۔

پرنسپل سیکرٹری اعظم خان، فرسٹ لیڈی بشریٰ بی بی اور زلفی بخاری اس کابینہ کے اہم ترین رکن بن گئے، یوں جہانگیر ترین کا رہتا سہتا اثر و رسوخ اور بھی کم ہوگیا۔

اقتدار ملنے کے بعد وزیر اعظم کے آنکھ اور کان انٹیلی جنس بیورو ہوتا ہے جسے عرف عام میں آئی بی کہا جاتا ہے۔ آئی بی کا سربراہ تقریباً ہر روز وزیر اعظم سے ملتا ہے یا پھر وزیر اعظم کے معتمد پرنسپل سیکرٹری کو روزانہ کی ملکی اور سیاسی صورتحال پر بریفنگ دیتا ہے۔ اعظم خان نے اپنے دوست اور پولیس کے ایک قابل افسر محمد سلمان خان کو آئی بی کا سربراہ لگوایا۔

ترین کے دوستوں کا الزام ہے کہ عمران اور جہانگیر ترین میں غلط فہمیوں کا آغاز آئی بی کی ایک رپورٹ سے ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ جہانگیر ترین، سپیکر اسد قیصر، پرویز خٹک اور کچھ دوسرے وزرا نے ایک غیر رسمی اجلاس میں پارٹی لیڈر اور پالیسیوں کے خلاف گفتگو کی ہے۔

عمران کے قریبی حلقے میں یہ بات زیر گردش رہی مگر پھر دم توڑ گئی۔ خان اور ترین کے درمیان فاصلے اس وقت بڑھے جب دونوں خاندانوں کی خواتین میں بھی بن نہ سکی۔ اس کی ایک وجہ فرسٹ لیڈی کی روحانی کرامات کے حوالے سے ترین خاندان کی خواتین کی غیر محتاط گفتگو بھی بتائی جاتی ہے۔

بعد ازاں خان کے قریبی حلقے میں اسد عمر بھی شامل ہوگئے جو ترین کے خلاف پہلے سے ہیں۔ اس سے ترین مخالف حلقہ اور طاقتور ہوگیا۔

دوسری طرف ترین نے بھی معاملات کو درست کرنے کے حوالے سے کوئی سنجیدہ اور بامقصد منصوبہ بندی نہ کی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وزیر اعظم خان، ترین کی زراعت، آٹا اور چینی کے حوالے سے کارکردگی پر بھی ناراض ہیں جبکہ ترین کے ساتھی کہتے ہیں کہ اعظم خان انھیں کچھ کرنے ہی نہیں دیتے تو ان کی ذمہ داری کیسی؟

آخر میں اس مشہور مثل کا ذکر، *حکمرانوں کی اگاڑی اچھی نہ پچھاڑی اچھی*

یاد آیا عمران کے ایک قریبی دوست نے کہا تھا کہ

عمران سے قربت اچھی اور نہ دوری اچھی

زیادہ قریب ہوئے تو وہ بور ہو جائے گا اور زیادہ دور ہوئے تو وہ بھلا دے گا۔ یقیناً ترین اس راز کو نہ سمجھ سکے۔

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی، ......ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ..... اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

شعبہ پاکستان

جوناگڑھ کے پاکستان میں انضمام کا فیصلہ
نواب کا نہیں شاہنواز بھٹو کا تھا

تحریر: شکیل اختر

تقسیمِ ہند کے وقت برصغیر میں ایسی سینکڑوں ریاستیں تھیں جہاں نوابوں کی حکومتیں تھیں۔ ایسی ہی ایک ریاست گجرات کے جنوب مغربی ساحلی خطے میں واقع جوناگڑھ تھی۔ ریاست جوناگڑھ سلطنتِ مغلیہ کے جرنیلوں نے قائم کی تھی جنھیں بابی نواب بھی کہا جاتا تھا۔ ان نوابوں نے ریاست کے ہندو مندروں اور مٹھوں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں اور ان کی مالی مدد کی۔ اس بڑی اور خوشحال ریاست کی 80 فیصد سے زیادہ آبادی ہندو تھی لیکن ریاست کے نواب نے انڈیا کے برعکس پاکستان میں ضم ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ مقامی بزرگوں اور خطے کے مورخین کا کہنا ہے کہ نواب محمد مہابت خان سوم نے ریاست کو پاکستان میں ضم کرنے کا فیصلہ اپنے دیوان شاہنواز بھٹو کے دباؤ میں آ کر کیا تھا۔ شاہنواز بھٹو پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے والد تھے اور عارضی طور پر نواب کے دیوان مقرر ہوئے تھے۔ 85 سالہ مورخ ہریش شمبھو پرساد دیسائی کے والد نواب آف جوناگڑھ کے ریونیو کمشنر تھے۔

ان کا کہنا ہے پاکستان میں شامل ہونے کے فیصلے پر لوگ حیران رہ گئے تھے۔ پبلک شاک میں آ گئی۔ کیونکہ نواب کو لوگ جس طرح جانتے تھے وہ بالکل کمیونل نہیں تھے۔ پاکستان میں جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے پاکستان یہاں سے بہت دور ہے۔ کوئی فضائی رابطہ نہیں تھا، کسی طرح پاکستان سے ملنا ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی نواب ایسا کوئی فیصلہ کریں یہ لوگوں کو منظور نہیں تھا۔

ہریش دیسائی بتاتے ہیں کہ پاکستان میں انضمام کے اعلان کے بعد جوناگڑھ میں کوئی بڑا فساد نہیں ہوا لیکن لوگوں میں اتنی گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی کہ ایک وقت ایسا آ گیا کہ جو سرکاری ملازم تھے، جو بوڑھے تھے اور جو کہیں جا نہیں سکتے تھے ان کے سوا پورا جوناگڑھ خالی ہو گیا۔ دیہات میں لوگوں نے اپنے گھر والوں کو دوسری ریاستوں میں بھیج دیا تھا۔ ان کا کہنا ہے پاکستان میں ضم ہونے کا فیصلہ نواب کا نہیں بلکہ ان کے عارضی دیوان شاہنواز بھٹو کا تھا۔ بھٹو نے نواب مہابت خان کو عملی طور پر نظر بند کر دیا تھا۔ فیصلے کے بعد کسی سے کبھی ملنے نہیں دیا۔ جام نگر کے مہاراجہ دگ وجے ان کے بہت قریبی دوست تھے، انھوں نے نواب سے ملنے کی کوشش کی تو انھیں بھی نہیں ملنے دیا۔

غلام رسول خاں یوسف زئی اس وقت 15 برس کے تھے۔ انھوں نے اس وقت کا منظر یاد کرتے ہوئے بتایا: ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ خوف کا ماحول تھا، کوئی گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا، سب لوگ گھروں میں بیٹھے ہوتے تھے۔ ان کا بھی کہنا ہے کہ پاکستان میں ضم ہونے کا فیصلہ نواب مہابت خان کا نہیں تھا۔ دنیا کہتی ہے کہ (شاہنواز) بھٹو نے انھیں بہکایا۔ بھٹو صاحب انھیں پاکستان لے گئے۔ ہم تو اس وقت نا سمجھ تھے لیکن والد صاحب اور سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ بھٹو کے کہنے پر وہ پاکستان گئے۔

خیال رہے کہ نواب مہابت خان اس افراتفری کے درمیان اپنی بیگمات اور بچوں کے ہمراہ ایک ڈکوٹا طیارے کے ذریعے پاکستان چلے گئے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ ان کے خاندان کے دیگر افراد بھی پاکستان، امریکہ اور یورپ منتقل ہو گئے۔ بس کچھ دور کے رشتے دار باقی بچے ہیں جو الگ الگ مقامات پر بس گئے ہیں۔

آزادی کے چند مہینے بعد ریاست کو انڈیا میں باضابطہ طور پر ضم کر لیا گیا تھا اور جوناگڑھ کی نئی نسل اس بات پر خوش ہے کہ یہ خطہ پاکستان میں شامل نہیں ہو سکا۔ چراغ ونود بھائی ٹھکرار کہتے ہیں اگر جوناگڑھ پاکستان میں چلا گیا ہوتا تو یہاں کی ثقافتی وراثت مٹ گئی ہوتی۔ یہاں دو ہزار برس پرانے بدھسٹ غار ہیں، شہنشاہ اشوک کے قدیم ستون ہیں، مقدس سدرشن تالاب ہے۔ یہ سبھی ختم ہو گئے ہوتے۔ قانون کی ایک نوجوان لیکچرار شائستہ کھوکھر بھی انڈیا میں رہ جانے پر خوش ہیں۔ پاکستان کے بارے میں سنتے ہیں کہ وہاں لڑکیوں پر کتنی پابندیاں ہیں۔ اگر ہم وہاں ہوتے تو ہم وہ بہت کچھ نہ کر پاتے جو یہاں کر پاتے ہیں۔

پاکستان میں انضمام کے اعلان کے بعد جوناگڑھ میں کوئی بڑا فساد نہیں ہوا

آزادی کے وقت پاکستان کے ساتھ جانے کے فیصلے کا ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر کبھی کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔ چراغ کہتے ہیں کہ یہاں کوئی یہ نہیں سوچتا کہ یہ فیصلہ ہندو نے کیا تھا یا مسلم نے۔ آزادی سے پہلے بھی ہندو مسلم ساتھ ساتھ رہتے آئے تھے اور یہی کلچر آج بھی ہے۔ جوناگڑھ ہندو مسلم ثقافت کا مجموعہ ہے۔ مقامی صحافی حنیف کھوکھر کہتے ہیں کہ یہاں کے لوگ یہی سوچتے ہیں کا پاکستان میں انضمام کا فیصلہ غلط تھا اور یہ فیصلہ نواب مہابت خان کا نہیں تھا۔ آج بھی لوگ کہتے ہیں اگر نواب یہاں رک گئے ہوتے تو بہت عزت کے ساتھ رہتے۔ آج کی نسل پر ان واقعات کا کوئی منفی اثر نہیں ہے۔ جوناگڑھ اب گجرات کا ایک بڑا سیاحتی مرکز ہے۔ نواب کے محلات، مہمان خانے اور شاہنواز بھٹو کی رہائش گاہ اب میوزیم اور سرکاری دفاتر میں تبدیل کر دیے گئے ہیں۔

مقامی لوگوں کو تقسیم سے پہلے کی اپنی مشترکہ وراثت پر فخر ہے۔ جگہ جگہ خوبصورت مقبرے اور عالیشان عمارتیں جوناگڑھ کی خوشحالی اور شان وشوکت کا پتہ دیتی ہیں۔ ماضی کی یہ خوبصورت عمارتیں اور مقبرے یہاں کے نوابوں اور تاریخ کی یاد دلاتی ہیں لیکن تقسیم ہند کی سات دہائیوں بعد پاکستان سے جوناگڑھ کے انضمام کے اعلان کی یادیں اب تاریخ میں کہیں گم ہو چکی ہیں۔

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے ”ادارہ“ پُرعزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاءاللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدردانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد ”ہفتہ وار“ کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جا رہا ہے۔

سقوط حیدرآباد: مسلمان حاکم کی خواہش کے باوجود انڈیا کی یہ ریاست پاکستان کا حصہ کیوں نہ بن سکی؟

تحریر: مرزا اے بی بیگ

حیدرآباد ریاست کے ساتویں فرمانروا میر عثمان علی نے ۳۷ سال حکومت کی اور وہ اپنے وقت میں دنیا کے امیر ترین لوگوں میں سے تھے

یکم نومبر 1947، لاہور

انڈیا آزاد ہو چکا ہے، ایک نیا ملک پاکستان معرض وجود میں آ چکا ہے لیکن خطے کی تین بڑی ریاستوں کشمیر، حیدرآباد اور جوناگڑھ کا مستقبل غیر واضح ہے۔ ان تینوں ریاستوں نے آزاد رہنے کا فیصلہ کیا ہے جبکہ انڈیا اور پاکستان ان کو اپنے ساتھ ملانے کی خواہش رکھتے ہیں۔

انڈیا کے آخری وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کے گورنر جنرل اور قائداعظم محمد علی جناح کو یکم نومبر سنہ 1947 کو ایک تحریری تجویز پیش کی جس میں ان ریاستوں میں استصواب رائے کروانے کی بات کی جہاں کے حکمراں خطے کی اکثریت کے بجائے اقلیت سے آتے ہیں۔

ہر چند کہ یہ پیشکش بنیادی طور پر کشمیر کے لیے تھی لیکن انڈیا کے ماہر قانون اور کشمیر، حیدرآباد اور جوناگڑھ پر تین مختلف کتابوں کے مصنف وتجزیہ نگار اے جی نورانی کا کہنا ہے کہ 'محمد علی جناح نے تنازعے کے پرامن حل کا ایک بڑا موقع گنوا دیا اور ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔'

ان کا کہنا تھا کہ اگر محمد علی جناح نے ماؤنٹ بیٹن کی تجویز مان لی ہوتی تو انھیں کشمیر ہاتھوں ہاتھ مل گیا ہوتا اور حیدرآباد میں کشت وخون کا بازار بھی گرم نہیں ہوتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ محمد علی جناح کا خیال تھا کہ اگر انڈیا کے دونوں بازو کٹ جائیں تو وہ زندہ رہ سکتا ہے لیکن اگر اس کا قلب نکال دو تو وہ جی نہیں پائے گا۔ یعنی ان کے مطابق حیدرآباد 'انڈیا کا قلب' تھا۔

دوسری جانب حیدرآباد کو انڈیا میں ضم کروانے والے ہندو رہنما سردار ولبھ بھائی پٹیل نے حیدرآباد کو انڈیا کے 'دل کا ناسور' کہا اور اس کے آپریشن کو ضروری قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف فوجی کارروائی کروائی۔

دنیا کے امیر ترین شخص کی ریاست

یہ وہی حیدرآباد ہے جسے اس زمانے میں انڈیا کی خوشحال ترین ریاست کہا جاتا تھا۔ جس کا خزانہ معمور تھا اور جو تہذیب وثقافت کا گہوارہ کہلاتا تھا۔ یہاں گنگا جمنی تہذیب واقعتاً آباد تھی۔ یہ مختلف تہذیبوں کا سنگم تھا۔ اس کے آبائی باشندگان مختلف زبانیں بولنے والے تھے، اگر ایک بڑا طبقہ تیلگو زبان کا حامل تھا تو دوسرا کنڑ بولتا تھا جبکہ ایک علاقے میں مراٹھی بولنے والے تھے اور ان سب کو اردو زبان جوڑتی تھی جسے 19 ویں صدی کے اواخر میں ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا گیا تھا۔

یہ برصغیر کا وہ خطہ تھا جہاں انگریزوں کے تسلط کے بعد بھی اردو زبان کی ترویج اشاعت جاری تھی اور شعرا و ادیب کی پذیرائی کی جا رہی تھی۔ آصف جاہی خانوادے سے تعلق رکھنے والے نجف علی خان کا کہنا ہے کہ ان کے دادا حیدرآباد کے آخری نظام میر عثمان علی خان صدیقی عرف آصف جاہ (ہفتم) کی ریاست انڈیا میں سب سے بڑی ریاست تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے دادا نے '37 سال تک بلاتفریق مذہب وملت ریاست پر حکومت اور لوگوں کی خدمت کی۔

نظام حیدرآباد کے نام سے معروف عثمان علی خان اپنے زمانے میں دنیا کے

محمد علی جناح اور جواہر لعل نہرو کے درمیان لارڈ ماؤنٹ بیٹن

امیر ترین شخص تھے جن کی دولت کا تخمینہ تقریباً 250 ارب امریکی ڈالر لگایا جاتا ہے۔

ان کے پاس زر و جواہرات کا وسیع خزانہ تھا جس میں 20 کروڑ امریکی ڈالر مالیت کا ایک 185 قیراط کا جیکب ہیرا بھی تھا جسے وہ پیپر ویٹ (کاغذ کو دبانے والے وزن) کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاہم رواں سال دو اکتوبر کو نظام حیدرآباد کے وارثوں اور انڈیا کے حق میں ساڑھے تین کروڑ پاؤنڈ کی خطیر رقم کا فیصلہ ہوا ہے جو کہ حیدرآباد کے انڈیا میں ضم کیے جانے سے قبل برطانیہ میں پاکستانی ہائی کمشنر کے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کر دی گئی تھی اور اس وقت سے وہ وہیں جمع تھی جب کہ اس کے متعلق مقدمات جاری تھے۔

حیدرآباد کا انڈیا میں انضمام

نظام حیدرآباد کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے اور وراثت کے سلسلے میں 36 ویں نمبر پر آنے والے نواب نجف علی خان کا کہنا ہے کہ 17 ستمبر (1948) کے حملے کا زخم بہت گہرا ہے اور ابھی تک تازہ ہے۔ وہ یوم آزادی نہیں بلکہ قتل عام کا دن تھا جس کے اثرات آج تک محسوس کیے جاتے ہیں۔ انڈین حکومت حیدرآباد کے حملے کو 'پولیس ایکشن' کہتی ہے جیسے 'آپریشن پولو' بھی کہا جاتا ہے۔ انڈین حکومت کے مطابق یہ پولیس ایکشن ناگزیر تھا لیکن حیدرآباد کے سکالر سید علی ہاشمی نے اس کے جواب میں ایک کتاب اسی عنوان سے لکھ ڈالی ہے کہ اس حملے سے بچا جا سکتا تھا اور اس سے گریز ممکن تھا۔ ان کی کتاب اینیویٹیبل انویژن: 1948 حیدرآباد میں انھوں نے لکھا ہے کہ انڈیا میں 'برسر اقتدار گروپ یعنی انڈیا کے حکمراں ایک ترقی یافتہ ریاست (حیدرآباد) کو ہر حال میں انڈیا میں ضم کرنا چاہتے تھے۔'

یہی سوال جب سقوط حیدرآباد پر تحقیق کرنے والی پروفیسر اور حیدرآباد کے سینٹ اینز کالج میں صدر شعبۂ تاریخ ڈاکٹر اوما جوزف سے کیا گیا تو انھوں نے بی بی سی کو بتایا کہ 'ایک بار جب حیدرآباد اور انڈیا کے درمیان سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ (معاہدہ امتناع) طے پا گیا تو اس کے تحت حیدرآباد کو اپنی خارجہ پالیسی انڈیا کے حوالے کرنی تھی اور انھیں کسی دوسرے ملک سے براہ راست تعلق نہیں رکھنا تھا۔'

'لیکن نظام نے معاہدے کی پوری طرح خلاف ورزی کی۔ وہ بہت تیزی سے حیدرآباد میں اسلحہ جمع کر رہے تھے اور پاکستان کے ساتھ مستقل رابطے میں تھے۔ یہاں تک کہ وہ اس خیال کو بھی پال رہے تھے کہ حیدرآباد پاکستان کا حصہ ہو سکتا ہے۔ انڈیا کے لیے یہ بڑی تشویش کی بات تھی کہ اگر حیدرآباد پاکستان میں شامل ہو جاتا ہے تو یہ انڈیا کے بیچوں بیچ ملک کے لیے مستقل پریشانی کا سبب ہوگا۔' ڈاکٹر اوما جوزف نے مزید کہا کہ 'یہ کسی طرح قابل عمل نہیں تھا۔ جب مشرقی اور مغربی پاکستان زیادہ دنوں تک ایک ساتھ نہیں رہ سکے تو حیدرآباد کیسے رہ سکتا تھا کیونکہ وہ تو انڈیا کے بالکل درمیان میں تھا۔ اسی لیے سردار پٹیل نے حیدرآباد کو انڈیا کے پیٹ میں السر سے تعبیر کیا تھا۔' حیدرآباد کی اس وقت کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے زمانے کے ممتاز عالم سید ابوالاعلی مودودی نے اپنے رسالے 'ترجمان القرآن' کے سنہ 1948 کے پانچویں اور دسمبر کے شمارے میں لکھا: 'تقسیم کے بعد حیدرآباد انڈین یونین کے گھیرے میں آ چکا تھا اس لیے نہ باہر سے کوئی بڑی مدد اس کو پہنچ سکتی تھی اور نہ ہی اندر اس کا کوئی امکان تھا۔' ان حالات میں کوئی ہوش مند انسان یہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں 85 فیصدی غیر مسلم اکثریت پر 15 فیصد مسلم اقلیت کا وہ غلبہ و اقتدار برقرار رکھا جا سکتا ہے جو پہلے بالکل مختلف حالات میں قائم ہوا اور رہا تھا اور کسی مرد عاقل سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ حیدرآباد انڈین یونین سے لڑ کر اپنی خود مختاری قائم نہیں رکھ سکتا۔

'دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان کشمکش، مزاحمت اور جنگ کے بجائے اپنے مستقبل کے لیے کوئی ایسی راہ تلاش کرتے جس میں وہ کامل تباہی سے بچ بھی سکتے اور آئندہ اپنی اخلاقی و دینی حالت کو بہتر بنا کر کوئی نتیجہ خیز جدوجہد کرنے کے مواقع بھی انھیں حاصل رہتے لیکن جن لوگوں نے ایسی کوئی راہ سوچی اور بتائی وہ مسلمانوں کو دشمن نظر آئے۔ انھوں نے اپنی رہنمائی کے لیے ایسے لوگوں کو پسند کیا جو اندھے جوش، کھوکھلے نعروں، جھوٹی توقعات غلط امیدوں، بے بنیاد آرزوؤں اور بے زور لاف و گزاف کے ذریعہ سے ان کے غرور و نفس کو فی الوقت تسکین دے سکیں۔' وہ اس آواز پر مرمٹے کہ کوئی دِلی کے لال قلعہ پر آصف جاہی جھنڈا گاڑ دینے کی بات تو کرتا ہے۔ اس نشے میں 40 لاکھ کی پوری آبادی مست ہو گئی۔ کوئی یہ سوچ کر اپنے وقتی لطف کو کرکرا کرنے پر راضی نہ ہوا کہ آخر یہ کام ہوگا کس طرح، سب کے سب آنکھیں بند کر کے اس لاف زنی کے پیچھے چل پڑے اور اپنی قسمت پر ناز کرنے لگے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی انھیں ایسے بے نظیر لیڈر میسر آتے ہی چلے جاتے ہیں!' مولانا مودودی نے کسی شخص کا نام نہیں لیا لیکن نظام حیدرآباد کو بے بنیاد مشوروں سے نوازنے والوں کو نشانہ بنایا۔ دوسری جانب اے جی نورانی نے قاسم رضوی اور لائق علی کے ساتھ محمد علی جناح کا نام لیا۔ قاسم رضوی کی شعلہ بیان تقاریر نے نظام حیدرآباد کو اتنی جھوٹی امیدیں بندھا رکھی تھی کہ وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ ایک دن

نظام کا پرچم دہلی کے لال قلعے پر لہرائے گا۔

حیدرآباد میں محمد علی جناح کے کردار کے بارے میں مسٹر نورانی نے کہا: 'محمد علی جناح نے ہندوستان سے انتقام لینے کے لیے اپنے آدمی میر لائق کو حیدرآباد میں پروموٹ کیا۔ ان سے ان کے تجارتی تعلقات بھی تھے۔ محمد علی جناح نے غالباً مارچ 1947 میں حیدرآباد میں دو لاکھ روپے کی سرمایہ کاری بھی کی تھی۔' مسٹر نورانی نے محمد علی جناح کے چار اگست 1947 کے ایک انٹرویو کا ذکر کیا جو دہلی کے منٹس میں شامل ہے اور حیدرآباد پر ان کی کتاب 'دی ڈسٹرکشن آف حیدرآباد' میں بھی شامل ہے۔

کتاب میں شامل ضمیمے میں رقم ہے کہ 'محمد علی جناح نے کہا کہ ان کا خیال یہ ہے کہ عالی جاہ (نظام حیدرآباد) اور ان کے مشیروں نے انضمام کے خلاف اپنا ذہن بنا لیا ہے تو انھیں مضبوطی اور وفاداری کے ساتھ اس پر جمنا چاہیے۔ خواہ وہ (انڈیا) کوئی بھی معاشی پابندی کیوں نہ عائد کرے، عالی جاہ کا اس بات پر زور ہونا چاہیے کہ 'آپ چاہے جو کر لیں، جس طرح چاہو دھمکا لیں، لیکن میں انضمام کے کاغذات یا یونین میں شامل ہونے پر اس وقت تک رضامند نہیں ہو سکتا جب تک میرا ضمیر نہیں کہتا۔ آپ کو مجھے مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں اور مجھے اپنا فیصلہ لینے حق حاصل ہے۔ مسٹر نورانی کی کتاب میں شائع منٹس کے مطابق محمد علی جناح نے یہاں تک کہا کہ 'اگر حالات انتہائی خراب ہو جائیں تو اپنے بنیادی اصولوں سے انحراف کرنے کے بجائے لڑتے ہوئے جان دینا زیادہ بہتر ہے۔'

محمد علی جناح نے تاریخ کی سب سے بڑی شہادت یعنی امام حسین کی شہادت کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ حق کے لیے جان دینا کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ اے جی نورانی نے بہر حال نظام کی پالیسیوں کو حیدرآباد کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'نظام انتہائی بے وقوف انسان تھے اور انھیں قاسم رضوی جیسا شخص مل گیا یعنی سونے پر سہاگہ۔ انھیں جولائی 1948 میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک بہترین تجویز دی تھی جسے انھوں نے مسترد کر دیا۔' جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ بہترین تجویز کیا تھی، تو انھوں نے کہا کہ اس میں 'حیدرآباد کو بیرون ممالک سے رابطہ کرنے کی اجازت تھی۔' دوسری جانب سید ہاشم علی نے انڈیا کی جانب سے معاشی پابندیوں اور ریاست حیدرآباد کے 'اہم عہدوں پر فائز افراد کی غداریوں' کو بھی سقوط حیدرآباد کا سبب کہا ہے۔ دوسرے مورخین کا کہنا ہے کہ اس میں کمیونسٹوں کی تحریک اور ریاست کے کانگریسیوں کا بھی دخل ہے جنھوں نے انڈین قیادت کو گمراہ کن اشارے دیے۔

آپریشن پولو

حیدرآباد کی اکثریتی آبادی ہندو مذہب کی ماننے والی تھی اور وہاں کانگریس کے حامی انڈیا سے الحاق چاہتے تھے۔ دوسری جانب کمیونسٹوں کی تلنگانہ تحریک تھی۔ جبکہ پروفیسر اوماجوزف کا کہنا ہے کہ وہاں متعدد قسم کے اختلافات تھے۔ زمین داری کے خلاف کسانوں کی تحریک تھی، زبان کا مسئلہ تھا، یہاں تک کہ ملکی یعنی دیسی اور غیر ملکی کا بھی جھگڑا جاری تھا۔' اوماجوزف کے مطابق حیدرآباد میں شمالی انڈیا کے لوگوں کا تسلط تھا اور حیدرآباد ریاست کے لوگ اس کے خلاف تھے۔ ریاست کے باہر کے لوگوں کو غیر ملکی کہا جاتا تھا۔ ان تمام چیزوں نے نظام حیدرآباد کو اپنی فوج کو مستحکم کرنے کی جانب متوجہ کیا۔ دوسری جانب تقسیم ہند سے ابھرنے والے خلفشار کے دوران یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ نظام حیدرآباد، گوا میں پرتگالیوں اور پاکستان کی مدد سے خود کو مسلح کر رہے ہیں۔ اس خبر پر سردار پٹیل نے کہا کہ انڈیا میں ایک آزاد حیدرآباد کا وجود ناقابل برداشت ہے اور اسے ختم کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ انڈیا نے حیدرآباد کو اپنی ریاست بنانے کے لیے 36 ہزار مسلح فوج اتاری جبکہ دوسری جانب نظام حیدرآباد کے پاس صرف 24 ہزار فوج تھی اور اس میں بھی پوری طرح سے تربیت یافتہ فوجیوں کی تعداد محض چھ ہزار تھی جس میں عرب، روہیلا، پٹھان، ہندو اور دیگر مسلمان شامل تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے علاوہ ریاست کے پاس تقریباً دو لاکھ رضاکار تھے جن کی کمان قاسم رضوی کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی تعداد کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ یہ سب غیر تربیت یافتہ افراد تھے جو نظام حیدرآباد سے وفاداری کا اظہار کر رہے تھے۔ انڈین فوج نے جنوبی کمان کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ای این گوڈارڈ کی سربراہی میں حیدرآباد کے خلاف مختلف اطراف سے محاذ کھول دیے۔ مغرب میں ان کا رخ وجے واڑا کی جانب تھا تو مشرق میں شعلہ پور پر ان کی توجہ مرکوز تھی۔ 13 ستمبر 1948 کو حیدرآباد پر جو حملہ کیا گیا وہ صرف پانچ دنوں میں اختتام پذیر ہوا اور 18 ستمبر کو نظام کے کمانڈر ان چیف سید احمد العیدروس نے باضابطہ ہتھیار ڈال دیے۔ جب ہم نے پروفیسر اوماجوزف سے سوال کیا کہ کیا پاکستان کی جانب سے حیدرآباد کے لیے کوئی مدد نہیں آئی تو انھوں نے کہا کہ 'پاکستان میں ان دنوں سوگ کا ماحول تھا۔ 11 ستمبر کو بانی پاکستان محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے وہاں سے کوئی مدد نہیں آ سکی۔' انھوں نے مزید کہا: 'سرکاری یا تاریخی شواہد تو نہیں ملتے لیکن جب ہم نے بہت سے لوگوں سے انٹرویو کیا تو انھوں نے کہا کہ نظام اور ان کے بہت

سے وزرا یہاں تک کہ اس وقت کے وزیر اعظم میر لائق پاکستان کے ساتھ مستقل رابطے میں تھے اور انھیں امید تھی کہ اگر ایسی کوئی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو انھیں پاکستان سے مدد ملے گی۔ انھوں نے بتایا کہ جب انڈیا کے ساتھ انضمام کی تحریک جاری تھی تو نظام نے وہاں اخباروں کی اشاعت پر پابندی لگا دی تھی لیکن پاکستان سے شائع ہونے والے اخبار وہاں دستیاب تھے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا کتنا اچھا رشتہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ انٹرویوز کے دوران انھیں 'بہت سے لوگوں نے یہ بتایا کہ سردار پٹیل نے حملے کے لیے 13 ستمبر کی تاریخ اس لیے طے کی کہ ایک دن پہلے محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور اس لیے وہاں سوگ کا ماحول تھا اور ایسے کوئی شواہد نہیں ہیں کہ پاکستان نے وہاں سے کوئی مدد بھیجی تھی۔

البتہ یہ باتیں سامنے آئیں کہ نظام کے بہت سے قریبی افراد حملے سے قبل پاکستان منتقل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔' ہر چند کہ فوجی کارروائی پانچ دنوں تک ہی رہی لیکن اس میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور دیہی علاقوں میں فسادات کا بازار گرم رہا۔ یہاں تک کہ انڈیا کے اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے انڈین فوجیوں کی جانب سے شہریوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے گولی مارنے کی اطلاعات کے بعد فوجی کارروائیوں کی تحقیقات کے لیے سندر لال کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی۔ نواب نجف علی خان کا کہنا ہے کہ حکومت ہند نے سندر لال کمیٹی کی رپورٹ کی بروقت اشاعت نہیں کی اور اسے اب تک پارلیمان میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔

بہر حال اس رپورٹ میں 27 ہزار سے 40 ہزار کے درمیان لوگوں کے مارے جانے کی بات کہی گئی ہے جبکہ بعض دیگر تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ انڈیا کی اس کارروائی اور اس سے پیدا ہونے والے فسادات میں دو لاکھ سے بھی زیادہ افراد مارے گئے تھے۔ نجف علی خان کا کہنا ہے کہ حیدر آباد پر حملے کی سچائی کے لیے سندر لال کمیٹی کو منظر عام پر لانا ضروری ہے۔ انھوں نے انڈین حکومت سے سوال کیا کہ کوئی ریاست اپنے بادشاہ سے آزادی کیوں چاہے گی جب اس نے اپنی رعایا کے خلاف کوئی جرم نہیں کیا ہو۔ انھوں نے سوال کیا کہ حیدر آباد کو انڈیا میں ضم کرنے کے بعد نظام حیدر آباد کے خلاف کوئی مجرمانہ کارروائی کیوں نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس انھیں وہاں کا 'راج پرمکھ' یعنی گورنر کیوں بنایا گیا؟ اس کے بعد حیدر آباد کے معاملے کو اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا لیکن وہاں اتنی تاخیر ہوئی کہ وہ اپنی موت آپ مر گیا۔ دسمبر 1949 کو نظام حیدر آباد نے ایک سند جاری کی جس میں کہا گیا کہ انڈیا کا مستقبل کا آئین ہی حیدر آباد کا آئین ہوگا اور پھر ریاست حیدر آباد بالآخر 26 جنوری سنہ 1950 کو باقاعدہ انڈیا کا حصہ بن گیا۔ یہی وہ دن ہے جب انڈیا میں آئین نافذ کیا گیا۔

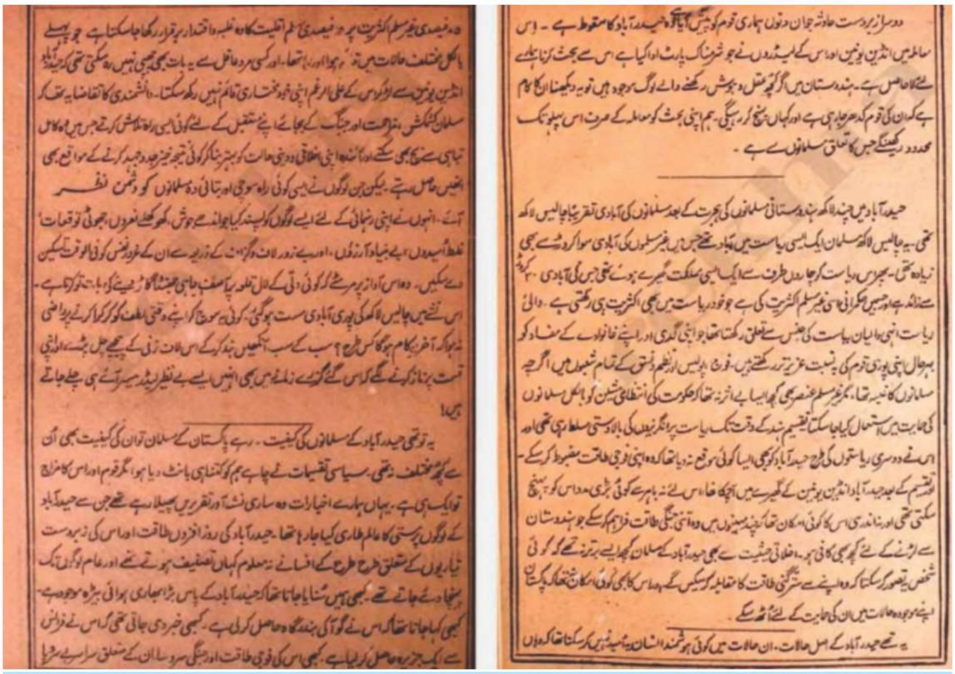

رسالہ ترجمان القرآن میں شائع حیدر آباد کا حال

اس کے بعد بھی میر عثمان علی خان انڈیا کے امیر ترین شخص تھے۔ ان کے ایک پوتے نجف علی خان کا کہنا ہے کہ جب 1965 میں انڈیا کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے حیدر آباد کا دورہ کیا تو انھوں نے قومی دفاع کے فنڈ میں میر عثمان علی خان سے دل کھول کر عطیہ دینے کی گزارش کی۔ یہ فنڈ چین کے ساتھ جنگ کے نتیجے میں قائم کیا گیا تھا۔ اس فنڈ میں میر عثمان علی خان نے 5000 کلو سونا عطیہ کیا جو آج کے اعتبار سے 1600 کروڑ روپے ہوتا ہے۔ نجف علی خان کا کہنا ہے کہ انڈیا کی تاریخ میں اتنا بڑا عطیہ کسی نے نہیں دیا لیکن اس کے ساتھ ان کا کہنا ہے کہ انڈیا نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

(بشکریہ بی بی سی)

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

لفافیت اور میریت

تحریر: انشال راؤ

حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے، حالات کی تبدیلی کا عوام سے بڑا گہرا تعلق ہے جو لوگوں کی رائے پر اثر انداز ہوتی ہے، مختلف سیاسی شخصیات مختلف نقطہ نظر رکھتے ہوئے اپنے مؤقف پر قائم رہتے ہیں لیکن حالات کی چھلنی جب سابقہ نقطہ ہائے نظر کو چھانتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وقت نے کس کے حق میں کروٹ لی ہے لیکن پاکستان دنیا کا واحد خطہ ہے جہاں ایک مخصوص طبقہ نہ صرف وقت کی کروٹ بلکہ حالات کی تبدیلی اور لوگوں کی رائے پر اثر انداز ہونے کی مسلسل مجرمانہ کوششوں میں لگا رہتا ہے بہت سی کامیابی سمیٹ لینے کے بعد مذکورہ طبقہ سر تا پیر غریق تکبّر ہے اور خود کو سیاہ و سفید کا مالک سمجھ کر خدائیت کے دعوے کے قریب ترین ہے یہ کس طرح حالات کی تبدیلی کو بھانپ کر لوگوں کی رائے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب لال مسجد کا مسئلہ اٹھا تو جنگ جیو گروپ اور بالخصوص حامد میر صاحب روز کبھی کس آنٹی کو تو کبھی کسی ماروی سرمد کو لیکر بیٹھ جاتے اور اپنی دانست میں ہر روز لال مسجد کے مکینوں کو دہشتگرد و دہشتگردی کا اکھاڑہ ثابت کر کے اٹھتے لیکن بعد میں یہی میر ابن میر صاحب تھے جو لال مسجد کو عظیم المیہ بنا کر پیش کرتے رہے، مجھے افسوس ہے کہ مذہبی طبقے کی طرف سے کسی ایک نے بھی گریبان پکڑنا تو دور ان صحافی نما زبردستی کے دانشوروں سے سوال تک نہ کیا کہ کل تک تم اسی لال مسجد کو ریاست کے اندر ریاست کس کی ایماء پر کہتے رہے۔

اس کے علاوہ جب نام نہاد عدلیہ بحالی تحریک اٹھی جسے اس کے قد سے بڑھا کر پیش کیا گیا اور ضرورت سے زیادہ جانبدارانہ کوریج دی گئی اور مشرف حکومت کو بدترین بنا کر پیش کیا جاتا رہا اور اس کامیابی کے ثمرات طبقہ مخصوصہ نے تو خوب سمیٹے لیکن عوام پر اس کے بھیانک نتائج سامنے آئے، وہ کراچی جو دنیا کا تیزی سے ترقی کرتا شہر تھا میریت کی نام نہاد جمہوریت نے آگ اور خون میں تبدیل کر دیا، پورا ملک انجینئرڈ دہشتگردی کی لپیٹ میں آ گیا، معیشت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرضے روشنی کی رفتار سے بڑھنے لگے، مہنگائی و ابتری کی وجہ سے حالات کی چھلنی نے جب سابقہ نقطہ ہائے نظر کو چھاننا شروع کیا تو فوراً میریت زدہ نام نہاد صحافی عوامی رائے پر اثر انداز ہونے کے لیے آمریت جمہوریت کا تقابل کر کے جمہوریت اور بغض مشرف میں قانون سب کے لیے، ایک معیار کے درس دینے لگے اور مشرف کو ڈکٹیٹر ڈکٹیٹر ڈکٹیٹر کی گردان پڑھنے لگے جس میں ایک ہی صیغہ لامحدود بار آتا ہے، زرا سوچئے کہ جسٹس افتخار چودھری کو ہیرو اور مشرف کو ڈکٹیٹر کہنے والوں میں سے کسی نے بھی کبھی یہ سوال اٹھایا کہ مشرف حکومت کو جائز قرار دینے والے افتخار چودھری صاحب نے قوم سے معافی کیوں نہ مانگی؟ یہ نام نہاد عدلیہ بحالی تحریک درحقیقت ایک طرف تو پاکستان میں اقتدار کی تبدیلی کے لیے بطور آلہ تھی جبکہ دوسری طرف پاک بھارت تنازعات کے خاتمے کی امیدوں کا تابوت ثابت ہوئی اور اس نے وہ سب خاک میں ملا دیا جو پاکستان کے لیے انتہائی مفید تھا جیسا کہ ریاض محمد خان نے اپنے آرٹیکل" Tragedy Of Pak-India " میں لکھا، اس میں کوئی دو رائے نہیں ایسے چند نام نہاد صحافیوں نے پاکستان میں صحافت جیسے عظیم پیشے کو بھی خطرناک حد تک مشکوک بنا دیا ہے، لفافیت و میریت ملّی و ملکی حیات پر سنگین حد تک اثر انداز ہو رہی ہے جس کی وجہ سے ملک میں سیاہ سفید بن کر اور سفید سیاہ سمجھے جانے لگے ہیں نتیجتاً ملّی حالات و معاشرہ کی ابتری بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے لیکن مخصوص طبقہ اقلیتی قابض مافیا کو زبردستی ملک و ملّت پر مسلّط کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے جس پر گلف نیوز نے لکھا کہ "کرونا بحران میں جب دنیا کرونا کے خلاف لڑ رہی ہے تو پاکستانی میڈیا سیاست کر رہا ہے" اور بیشک معمول کی نشریات سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے، ایسے ایسے تضادات اور مضحکہ خیز دلائل دیئے جا رہے ہیں کہ حیرانگی بھی حیران ہو کر رہ گئی ہے۔

پاکستان میں کرونا وائرس مغربی بارڈر سے زائرین کے زریعے منتقل ہوا جنہیں اصولی و شرعی طور پر آبادیوں سے دور قرنطینہ میں رکھنا ضروری تھا لیکن ان نام نہاد دانشوروں نے حکومت کے بنائے گئے قرنطینہ یونٹس کا ٹرائل شروع کر کے انہیں زبردستی شہروں میں منتقل کیے جانے پر حکومت کو مجبور کر دیا پھر کہتے ہیں کہ حکومتی نااہلی سے کرونا پھیلا، دوسری طرف بھارت کی ہندوتوا نسل پرست حکومت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تبلیغی جماعت کو نشانے پہ رکھ کر تبلیغیوں کے خلاف

پروپیگنڈہ شروع کر دیا جو کہ طارق جمیل کی دعا کا جواب بھی ہے مولانا طارق جمیل نے عمران خان کی کامیابی کے لیے دعا کی تو عمران خان کے مخالفین نے پوری تبلیغی جماعت کو سزا دینے کے لیے بھاڑے کے لبرلوں اور لفافیت زدہ صحافیوں کے زریعے پروپیگنڈہ شروع کر دیا لیکن یہ بھول رہے ہیں کہ آج طاقتور مغرب بھی ربّ ذوالجلال کے سامنے جھکنے پہ مجبور ہوگئی ہے تو یہ کونسے کھیت کی مولی ہیں اور انشاءاللہ یہ طبقہ ضرور ذلیل ورسوا ہوگا۔

کون ہے جو نہیں جانتا کہ سابقہ حکومتوں نے صحت، تعلیم وفلاحی شعبوں میں کیا کیا تباہی مچائی کہ اپنا علاج کروانے کے لیے انہیں خود بیرون ممالک کا سفر کرنا پڑتا ہے لیکن ہمارا میڈیا ہسپتالوں کی ناقص حالت کا ذمہ دار اس عمران خان کو قرار دے رہی ہے جس نے سب سے پہلے جمود زدہ گندے تالاب میں پتھر مار کر اس کی لہروں کو حرکت دیکر عوام کو اپنی حالت سدھارنے کے لیے جھنجھوڑا اور مافیا کے خلاف اٹھایا۔

عمران خان جس کا موقف تھا کہ ہماری آدھی آبادی روز کما کر روز کھانے والی ہے اچانک لاک ڈاون سے لوگ بھوک سے ضرور مر جائینگے جو کہ انتہائی احسن سوچ تھی لیکن زبردستی کے دانشوروں کے کیا کہنے کہ ان صاحبان نے تو بغض کپتان میں کروڑوں غریب اور لاکھوں مریضوں کو جیتے جی مار دیا، میرے ایک عزیز عارضہ قلب میں مبتلا تھے حیدرآباد لاک ڈاون کی وجہ سے طبی سہولیات نہ ملنے کی وجہ سے انتقال کر گئے ایسے پورے ملک میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگ ہونگے ویسے بھی کرونا سے پہلے دنیا میں مرنے والوں کی تعداد شوگر کے مریضوں کی زیادہ تھی۔

زرا سوچیے کہ میریت زدہ یہ طبقہ اگر سویڈن میں ہوتا تو کیا ہوتا جہاں آج ہزاروں کیسز ہونے کے باوجود لاک ڈاون نہیں، میکسیکو میں ہوتے تو کیا ہوتا جہاں ہزار سے زیادہ ہلاکتوں کے باوجود مکمل لاک ڈاون نہیں اور اگر چین میں ہوتے تو کیا ہوتا جہاں صرف ہبی صوبے کا رابطہ دوسرے صوبوں سے بند کر کے مناسب حکمت عملی کے تحت لاک ڈاون کیا گیا اور دوسری طرف عالمی پروپیگنڈے کو بھی مات دی، ان جگہوں پر آخر ایسے حضرات کیوں نہیں؟ چین میں کسی صحافی نے ووہان میں ہزاروں ہلاکتوں کا ذمہ دار حکومت کو قرار کیوں نہیں دیا؟ چین اچانک اتنا اوپر آیا کہ سپر پاور کی دوڑ میں شامل ہوگیا کیسے؟ اس کا جواب یہ بھی ہے کہ چین میں 1998 سے 2002 تک چُن چُن کر لفافیت زدہ صحافیوں کو سیدھا کیا گیا امریکہ نے شور مچایا لیکن چین نے ایک نہ سنی اور قانون کے مطابق لفافیت کو ہمیشہ کے لیے دفن کرتے ہوئے نیویارک بیسڈ امریکی تحقیقاتی رپورٹ کو بے معنی کر دیا۔

اب بھارت بھی چین کے پیٹرن پہ عمل پیرا ہوکر دنیا کی تیزترین بڑھتی ہوئی معیشت بن بیٹھا ہے لیکن پاکستان ام الخبائث وام المسائل کو نظرانداز کر کے تنزلی کے ریکارڈ توڑتا جارہا ہے جس کی وجہ یہی ہے کہ یہ طبقہ کبھی اصل مسائل کو اجاگر ہی نہیں کرتا، ان کے نزدیک تمام مسائل وتمام شعبوں کے ماہرین صرف چند سیاستدان ہیں بس انہیں بٹھا کر بندر تماشہ لگائے رکھتا ہے، لہٰذا اب وقت کی تیز ہواوں سے بغاوت کرنے کا وقت ہے اور اس طبقے کو راہ راست پر لانا ہر حال میں لازم اور فرض عین ہو چکا ہے۔

❁❁❁

غزل

دل میں ہے دور تک دھواں مطلب نکلتے ہی
جانے کہاں گئی فغاں مطلب نکلتے ہی

جس نے سکھائے تھے مجھے اخلاص کے رموز
اب مجھ سے ہے وہ بدگماں مطلب نکلتے ہی

آہ و فغاں زمین کے سینے سے اٹھ رہی
بدلا ہے رنگ آسماں مطلب نکلتے ہی

سوچا نہ تھا کہ لوگ یوں آئیں گے سامنے
نکلیں گے اتنے بدزباں مطلب نکلتے ہی

خوشبو گلوں کو چھوڑ کے دوش ہوا پہ ہے
ویراں ہے سارا گلستاں مطلب نکلتے ہی

جن کے سبب جہان میں شہرت ملی تجھے
اجڑی ہے بزمِ عاشقاں مطلب نکلتے ہی

باسط تمہارے واسطے سرتا پا ہے دعا
تانی ہے جس پہ یہ کماں مطلب نکلتے ہی

❁❁❁

—— باسط ممتاز سید ——

سیہون کا گم نام قلعہ

تحریر: مزمل فیروزی

سندھ میں متعدد تاریخی مقامات اور مختلف عبادت گاہوں کے ساتھ بزرگانِ دین کے مزارات بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں سندھی زبان کے نامور صوفی شاعر، حضرت لعل شہباز قلندر کا مزار خصوصی اہمیت کا حامل ہے، جہاں ہمہ وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ بلاشبہ، سندھ کی تاریخ لعل شہباز قلندر کے بغیر نامکمل ہے۔ اُن کا اصل نام حضرت سیّد عثمان مروندی ہے۔ تاریخی روایات سے پتا چلتا ہے کہ آج کا سیہون شریف، لعل شہباز قلندر ہی کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کا حامل ٹھہرا۔ ماضی میں یہ قدیم شہر، سنڈیمن، سنڈیمانا، شوآستان، سیوستان اور سیستان کے مختلف ناموں سے پُکارا جاتا رہا۔ تاہم، آج سیہون کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں وائس آف سندھ نے یہاں کی قدیم تہذیب، خصوصاً سیہون شریف کے حوالے سے ایک مطالعاتی دورے کا اہتمام کیا، جس کا مقصد لعل شہباز قلندر کی درگاہ کے دامن سے جُڑے سیہون کے قدیم و پُراسرار قلعے کے پوشیدہ راز اور وَرثے سے عوام النّاس کو روشناس اور آگہی فراہم کروانا تھا۔ دراصل قلعے کی تاریخ اور روایات اس قدر پیچیدہ اور قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں کہ اُن سے پردہ اٹھانا اور سائنسی خطوط پر اصل حقائق تک پہنچنا ایک دشوار گزار امر ہے۔ مذکورہ قلعے کی تاریخ کی بابت محققین مختلف آراء رکھتے ہیں۔ جنہیں تاریخ کے طلبہ اور موجودہ نسل کے لیے جاننا ضروری ہے کہ آج اس قلعے کے اصل نام سے بھی لوگ ناواقف ہیں۔ کچھ لوگ اس قلعے کو ’’سکندر کا قلعہ، کافر قلعہ، پرانا قلعہ‘‘ بھی کہتے ہیں، جب کہ مقامی لوگ اسے ’’اُلٹی بستی‘‘ کے نام سے پُکارتے ہیں۔

کراچی سے ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت کے بعد جب ہم سیہون پہنچے، تو لعل شہباز قلندر کے مزار سے کچھ آگے بڑھتے ہی، دُور سے مٹّی کے ٹیلوں کے چھوٹے چھوٹے پہاڑ دکھائی دیئے، ٹیلوں کے قریب پہنچنے پر پتا چلا کہ یہی ’’الٹی بستی‘‘، یعنی سیہون کا قلعہ ہے۔ گاڑی سے اُتر کر تھوڑا آگے بڑھے اور اس قلعے کے دامن میں پہنچے، تو تاریخ کے گم گشتہ ادوار کے خاکے نگاہوں کے سامنے آگئے کہ ماضی میں یہاں کبھی زندگی رواں دواں ہوگی، جیتے جاگتے انسانوں کے قہقہے گونجتے ہوں گے۔ صدیوں کی تاریخ پر محیط اس بستی کی بچی کھچی دیواروں کی بناوٹ دیکھ کر با آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے زمانے میں یقیناً یہ ایک دفاعی قلعہ رہا ہوگا۔ تاہم، قلعے کے قریب ایک چھوٹی سی بستی آج بھی موجود ہے۔ یہاں کے مقامی لوگوں سے بات چیت ہوئی، تو انہوں نے اس قلعے سے متعلق یہ روایتی لوک کہانی سنائی کہ اس دَور کے ظالم حاکم، راجہ چوپٹ نے، جو اس قلعے میں مقیم تھا، جھولے لعل سائیں کے خادمِ خاص، بودلہ بہار کو شہید کردیا، جس پر جھولے لعل سائیں نے عالمِ جلال میں اپنے کشکول کو زمین پر اس قدر زور سے پٹخا کہ

پوری بستی اُلٹ گئی۔ جس کے بعد سے اس جگہ کا نام ''الٹی بستی'' پڑ گیا۔ تاہم، تاریخ کے اوراق سے پتا چلتا ہے کہ سیہون کا یہ تاریخی قلعہ قبل از مسیح سے موجود ہے، کیوں کہ 326 قبلِ مسیح میں سیہون کا حکمران، راجا سامبس تھا، راجا سامبس نے سکندرِ اعظم کے خلاف بغاوت کی تھی۔ تاریخ کے مطابق، سامبس کا تعلق بدھ مت سے تھا۔ اُس زمانے میں اس شہر کا نام سنڈیمن تھا۔ سیہون قلعے کے بارے میں ایک اور روایت یہ بھی مشہور ہے کہ یہ قلعہ سکندرِ اعظم نے تعمیر کیا تھا، اسی وجہ سے اسے سکندر کا قلعہ کہا جاتا ہے، جب کہ بہت سے محققّین کے مطابق جب سکندر اعظم سندھ میں داخل ہوا، تو یہ قلعہ موجود تھا۔ ایک اندازے کے مطابق، یہ قلعہ رائے سہاسی دوم کے زمانے میں 600 عیسوی سے قبل تعمیر کیا گیا۔ رائے سہاسی نے 603 عیسوی میں وفات پائی تھی، اس کے بعد اس قلعے کو 713ء میں محمد بن قاسم نے فتح کیا۔ بعدازاں یہ قلعہ مختلف حکمرانوں کو تحفظ فراہم کرتا رہا، بالآخر 1520ء میں شاہ بیگ ارغون نے اسے سمہ حکمرانوں سے خالی کروایا۔ وقت کی بے رحم موجوں کے سبب اگرچہ اس قلعے کی وہ شان و شوکت تو برقرار نہیں رہی، تاہم، اس کی خستہ حال بچی کھچی دیواریں آج بھی اس قلعے کی شکست و ریخت اور تباہی کی داستانیں بیان کرتی ہیں۔

برطانوی فوج کا لیفٹیننٹ ولیم ایڈورڈز اپنی کتاب ''Sketches in Scinde'' میں اس قدیم قلعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''یونانی دَور کی اس تعمیر سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے سکندر اعظم کا گزر ہوا تھا اور اس نے اپنی فوج کے لیے اس قلعے کی مرمت کروائی تھی۔'' جب کہ معروف مؤرخ، بھرمل مہرچند ایڈوانی نے اپنی کتاب ''سندھی ہندن جی تاریخ'' اور ''سندھ کے نام وَر محقق، اشتیاق انصاری نے اپنی کتاب ''سندھ جا کوٹ آئیں قلعہ'' میں بھی سیہون کے قلعے کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

اس ضمن میں محکمۂ آثارِ قدیمہ و نوادرات کے ڈائریکٹر جنرل، منظور احمد کناسرو کا کہنا ہے کہ ''فرانسیسی آثارِ قدیمہ کے ماہر، پروفیسر ڈاکٹر مونک کیوران نے سیہون کے اس تاریخی قلعے کی دریافت پر کلیدی کردار ادا کیا۔ انہوں نے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے اُس وقت کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر، مظہر علی میرانی کے زیرِ نگرانی 2002ء میں کی گئی کھدائی کے نتیجے میں نکلنے والی قیمتی نوادرات سیہون میوزیم میں رکھوائیں۔

بعدازاں، یہاں سیہون میوزیم اور ریسٹ ہاؤس بھی تعمیر کیا گیا۔ ہم میوزیم اور ریسٹ ہاؤس کا جائزہ لینے گئے، تو وہاں کی خستہ حالی دیکھ کر مایوسی ہوئی، بھاری مالیت سے تعمیر کیے گئے اس میوزیم اور ریسٹ ہاؤس کی دیکھ بھال کے لیے وہاں کوئی نہ تھا۔ بہرحال، آج اس قدیم تاریخی قلعے میں وہ طلسماتی کشش بھی باقی نہیں رہی، جو سندھ کے دوسرے قلعوں میں ہے اور اس کی بڑی وجہ یہاں اس کی باقیات کا نہ ہونا ہے۔ سیہون آنے والے زائرین اور تفریح کی غرض سے آنے والے بھی اس قلعے کے بچے کھچے آثار بھی ختم کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ دُور سے مٹّی کا ایک بڑا ڈھیر نظر آنے والے اس قلعے کی دیواریں اور فصیلیں مٹّی ہی سے بنی ہیں، جو آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جارہی ہیں اور اس کی معدومیت میں آخری کیل ٹھونکنے والے یہاں کے قبضہ مافیا ہیں، جو اردگرد کی زمینوں پر تیزی سے قبضہ کرتے چلے جارہے ہیں۔

اب صرف چھوٹا سا حصّہ ہی رہ گیا ہے، جو علامتی طور پر قلعے کے ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ وہ قلعہ جو ماضی میں حکمرانوں کو تحفّظ فراہم کیا کرتا تھا، اب خود اس کے تحفظ کی طرف کسی کا دھیان نہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ و نوادرات کا وفاق کے پاس جانے کا جتنا نقصان صوبہ سندھ کو ہوا، کسی اور صوبے کا نہیں ہوا۔ تاہم، غنیمت ہے کہ اٹھارہویں ترمیم کے بعد سے محکمۂ آثارِ قدیمہ و نوادرات حکومتِ سندھ کے پاس آجانے کے بعد سے محکمہ اپنی تہذیب کے آثار بچانے کے لیے کوشاں ہے۔

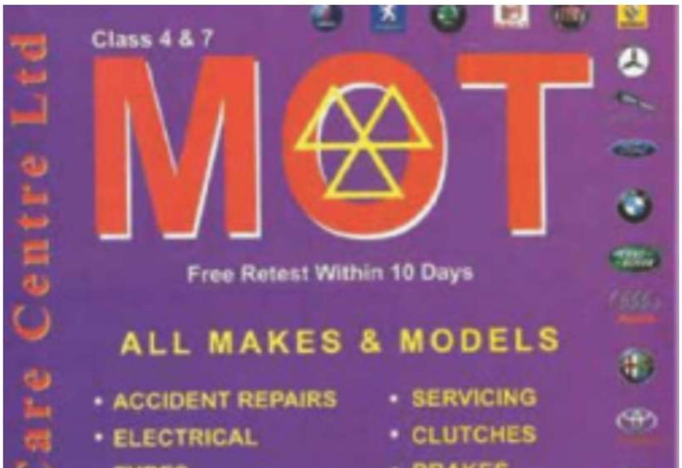

پگاڑا سے خان تک

تحریر: رؤف کلاسرا

جہانگیر ترین کے انٹرویوز سے لگتا ہے' انہیں احساس ہے کہ عمران خان صاحب نے اپنی ساکھ بنانے کے لیے انہیں استعمال کر کے ڈمپ کیا ہے' حالانکہ انہوں نے تو خان کو وزیراعظم بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سوچنے کو تو عمران خان صاحب بھی سوچ سکتے ہیں کہ جہانگیر ترین نے انہیں الٹا استعمال کیا اور وزیراعظم بنانے تک جو انہوں نے وسائل خرچ کیے تھے وہ وزیراعظم بنتے ہی سود سمیت وصول کر لیے ہیں۔

سیاست اس چیز کا نام ہے کون کب کس کو استعمال کر سکتا ہے اور جو جیتا ہے وہی سکندر؟ مجھے یوسف رضا گیلانی سے لندن میں اگست 2007 میں ہونے والی ملاقات یاد آئی۔ برسوں جنرل مشرف کی قید میں رہنے بعد پہلی دفعہ لندن آئے ہوئے تھے۔ بینظیر بھٹو نے پارٹی راہنماؤں کا اجلاس رحمن ملک کے گھر بلایا ہوا تھا۔ وہ جنرل مشرف سے خفیہ ڈیل کر رہی تھیں اور نئے الیکشن کے لیے تیاریاں بھی۔ گیلانی صاحب کا فون آیا: کہاں ہیں؟ میں ان دنوں ایک پاکستانی انگریزی اخبار کے لیے لندن سے رپورٹنگ کر رہا تھا۔ میں انہیں ملا' اور پھر ایجوویئر روڈ پر ہم نے پیدل چلنا شروع کیا۔

مجھے محسوس ہوا' وہ ڈپریس اور اداس ہیں۔ حیران ہوا کہ وہ رہائی پا کر لندن آئے ہیں' بینظیر بھٹو سے برسوں بعد مل رہے ہیں' انہیں خوش باش ہونا چاہیے تھا۔ پھر انہوں نے جنرل مشرف کی جیل بھگت لی تھی لیکن پیپلز پارٹی چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے تھے حالانکہ مشرف کے قریبی مشیر طارق عزیز انہیں جیل میں ملے تھے اور مشرف کو جوائن کرنے کے بدلے بڑی پیشکش بھی کی تھی۔ گیلانی صاحب ڈٹے رہے اور جیل بھگت لی۔ اب جب وہ آٹھ برس بعد بینظیر بھٹو سے مل رہے تھے تو ان کا خیال تھا وہ انہیں زیادہ اہمیت دیں گی' لیکن پارٹی اجلاس میں انہیں وہ اہمیت نہ ملی جس کی وہ اپنے تئیں توقع رکھتے تھے۔ شاید بی بی کے ذہن میں تھا کہ کہیں گیلانی کا قد مزید اونچا نہ ہو جائے' وہ پارٹی میں زیادہ اہمیت اختیار نہ کر جائیں اور کل کو ان سے کنٹرول ہی نہ ہوں۔

یہی رویہ بعد میں نواز شریف نے جاوید ہاشمی صاحب کے ساتھ روا رکھا جب وہ جدہ سے واپس لوٹے تو ایسا سلوک کیا کہ جاوید ہاشمی پارٹی چھوڑ گئے۔ آصف زرداری نے تو اختیارات ملتے ہی گیلانی صاحب کو وزیراعظم بنا کر جنرل مشرف کی جیل بھگتنے کا ازالہ کر دیا' لیکن جاوید ہاشمی کو شریفوں نے عبرتناک مثال بنا دیا۔

خیر ایجوویئر روڈ پر چلتے ہوئے گیلانی صاحب کہنے لگے کہ آج بینظیر بھٹو کو اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے پیر پگاڑا یاد آ گئے۔ جب آٹھ برس پہلے بینظیر بھٹو صاحبہ کو ملا تھا تو وہ اور تھیں۔ آج وہ بالکل مختلف بینظیر بھٹو تھیں۔ آج کے اجلاس میں دیکھا' انہیں پارٹی کے معاملات پر کتنی گرفت ہے۔ انہیں ہر بندے کا پتہ ہے کہ کب کس بندے کو کہاں استعمال کرنا ہے اور مرضی کے نتائج لینے ہیں... یہ جاننا سیاستدان کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ کب کس بندے کو اپنے سیاسی فوائد کے لیے استعمال کر سکتا ہے اور اگلے کو ہوا بھی نہ لگنے دے''۔

اسی دوران مجھے ایجوویئر روڈ پر عربی کھجوروں کی ایک دکان نظر آئی۔ میں نے کہا'

گیلانی صاحب! ٹھہریں عربی کھجوریں خریدنے دیں کہ مجھے بہت پسند ہیں۔

کھجوریں خرید کر باہر نکلا تو باہر شہباز شریف گزر رہے تھے۔ گیلانی صاحب اور مجھے دیکھا تو رک گئے۔ اچھے طریقے سے ملے۔ شہباز اور گیلانی کی ملاقات بھی آٹھ برس بعد ہو رہی تھی۔ بس آ گئی تو شہباز شریف اس پر بیٹھ گئے۔ میں نے بات وہیں سے جوڑی تاکہ پتہ کروں بینظیر بھٹو سے ملنے کے بعد گیلانی صاحب کو پیر پگاڑا کیوں یاد آ گئے تھے؟ انہوں نے ایک کہانی سنانا شروع کی۔

1986 میں محمد خان جونیجو وزیراعظم تھے۔ نواز شریف پنجاب کے وزیراعلیٰ۔ گیلانی اس وقت جونیجو حکومت میں ایک وزیر تھے۔ آرمی چیف جنرل ضیاء ملک کے صدر تھے۔ ایک دن گیلانی صاحب کو پیر پگاڑا نے بلایا اور کہا 'برخوردار آپ سے ایک کام ہے۔ گیلانی صاحب پیر پگاڑا کے رشتے دار بھی تھے۔ (ان کے ایک بیٹے کی شادی پیر پگاڑا کی پوتی سے ہوئی ہے' کچھ برس پہلے)۔

پیر پگاڑا نے کہا' آپ پنجاب جائیں اور نواز شریف کے خلاف تحریک عدم اعتماد لائیں' نواز شریف کو ہٹانا ہے۔ گیلانی کچھ حیران ہوئے تو پگاڑا نے کہا' جی آپ جائیں' سب کی اجازت ہے۔ ان کا اشارہ جنرل ضیاء کی طرف تھا۔

گیلانی خوشی خوشی لاہور پہنچے اور کام شروع کر دیا۔ بہت جلد یہ خبر لاہور میں پھیل گئی کہ نواز شریف سے بڑے ناراض ہو گئے ہیں۔ گیلانی نے ایک ایک ایم پی اے سے ملنا شروع کر دیا۔ سب ایم پی ایز نے نواز حکومت جاتے دیکھ کر اپنی سیٹیں اگلے سیٹ اپ میں پکی کرنے کیلئے ملتان کے پیر کے ہاتھ پر بیعت کرنی شروع کر دی۔ ایک دن گیلانی صاحب کو اندازہ ہوا کہ اب ان کے پاس نمبرز پورے ہو گئے ہیں' جب چاہیں عدم اعتماد کی تحریک لا سکتے تھے۔ انہوں نے گرو کو پیغام بھیجا: مرشد کام ہو گیا' اب کیا حکم ہے؟ مرشد نے جواب دیا: بتاتے ہیں۔

اسی شام پی ٹی وی کے خبرنامہ میں خبر چلی: پنجاب کے وزیراعلیٰ نواز شریف نے صدر جنرل ضیاء سے پنڈی میں ملاقات کی اور جنرل ضیاء نے نواز شریف کے لیے اپنی پوری حمایت کا اعلان کیا ہے۔ یہ سن کر گیلانی صاحب کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب اگلے دن اخبارات میں پیر پگاڑا کا بیان چھپا: نواز شریف کی بوری میں سوراخ تھے ہم نے سی دیے۔

مایوس گیلانی اسلام آباد پہنچے اور مرشد کے چرنوں کو چھوا اور پوچھا: گرو یہ آپ نے کیا کیا؟ میری تو سیاسی ساکھ تباہ ہو گئی ہے۔ پگاڑا نے قہقہہ لگایا اور بولے: آپ درست سمجھے' ہم نے تمہاری ساکھ ہی تو استعمال کی ہے نواز شریف کو اوقات میں لانے کے لیے۔ گیلانی صاحب چونکے۔ پگاڑا بولے:

جنرل ضیاء کو کچھ عرصے سے یہ خبریں مل رہی تھیں نواز شریف نجی محفلوں میں کہتا ہے کہ میں وزیراعلیٰ اپنی وجہ سے ہوں جنرل ضیاء کا کوئی کمال نہیں۔ ہم نے سوچا ذرا بتا دیتے ہیں وہ کس کی وجہ سے وزیراعلیٰ ہیں۔ میں نے تمہارا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ تم جوان ہو، تمہاری ساکھ اچھی ہے۔ تم سرائیکی علاقے سے ہو اور سرائیکی ایم پی ایز کو آسانی سے کھینچ سکتے تھے اور پھر ایک گدی بھی ہے' اوپر سے میرے رشتہ دار ہو اور میں جنرل ضیاء کے قریب سمجھا جاتا ہوں' سو تم پر سب نے جلدی بھروسہ کرنا تھا۔ یوں ہم نے تمہیں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

گیلانی صدمے کی حالت میں مرشد کو دیکھتے رہے اور منہ سے صرف اتنا نکلا: گرو یہ بتا دیں ایک سیاستدان کب اس قابل ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے کسی کو استعمال کرے اور اسے پتہ ہی نہ لگنے دے۔

پگاڑا بولے: تیس سال لگتے ہیں جب آپ یہ فن سیکھتے ہیں۔ گیلانی بولے بینظیر بھٹو کو بھی تیس برس اب ہوئے ہیں اور اب انہیں سب پتہ ہے۔ جو کام پیر پگاڑا کے بقول سیاستدان تیس برس میں سیکھتا ہے وہ عمران خان صاحب نے بیس برس میں ہی سیکھ لیا ہے۔ جہانگیر ترین کو ٹی وی انٹرویوز میں سن کر احساس ہو رہا ہے کہ انہیں بھی خان نے استعمال کیا۔ عمران خان کو وزیراعظم بنانے کے لیے دن رات ایک کیا۔ بندے توڑ کر پارٹی میں لائے اور خزانوں کا منہ کھول دیا۔ جہاز اڑائے۔ اب پتہ چلا ہے کہ شوگر سکینڈل میں ایک کو قربانی دینی تھی۔ کلہاڑا ترین پر گرا۔ ترین حیران ہیں کہ خود عمران خان کابینہ نے ایکسپورٹ اور سبسڈی کی پہلے منظوری دی اور اسے کہا جاؤ ایکسپورٹ کرو' عثمان بزدار سے تین ارب لے لو۔ اب اچانک خود ہی عمران خان صاحب اپنے فیصلے کے خلاف تحقیقات کر کے ترین کے خلاف کارروائی کا حکم دے کر عوام اور میڈیا سے داد بھی وصول کر رہے ہیں۔

جہانگیر ترین کو سیاست میں صرف دس برس ہوئے اور عدالت سے خود کو نااہل بھی کرا بیٹھے جبکہ عمران کو سیاست میں بائیس برس ہو چکے ہیں۔ سیاست کی جو اعلیٰ ترین ڈگری لینے کے لیے پیر پگاڑا نے تیس سال رکھے تھے' وہ ڈگری عمران خان صاحب نے آٹھ برس پہلے لے لی ہے۔ کچھ طالب علم جینئس ہوتے ہیں اور دو تین کلاسز کا اکٹھا امتحان دے کر آگے نکل جاتے ہیں۔ ترین صاحب کی بدقسمتی وہ نالائق اور عمران خان اس کھیل میں لائق نکلے۔ پیر پگاڑا کہیں سگار سلگا کر مسکرا رہے ہوں گے کہ ایک اور ملتانی بکرا بن گیا ہے۔

انڈین تاریخ میں تیمور لنگ کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے؟

چنگیز خان پوری دنیا کو ایک ہی سلطنت کے دائرے میں لانا چاہتا تھا تاہم تیمور لنگ کا ارادہ سلطنت سے زیادہ لوگوں پر دھونس جمانا تھا

اداکار سیف علی خان اور کرینہ کپور نے اپنے نوزائیدہ بیٹے کا نام جب سے تیمور خان رکھا ہے تبھی سے انڈیا پر 14ویں صدی کے حملہ آور تیمور خان کے حوالے سے بھی بحث چھڑی ہوئی ہے۔

نام رکھنے کے تعلق سے سوشل میڈیا پر ہونے والی بحث میں بہت سے لوگوں نے اسے دونوں کا ذاتی معاملہ کہا تو بہت سے لوگوں کو اس بات پر اعتراض ہے کہ ایک ظالم حملہ آور کے نام پر بیٹے کا نام رکھنا درست نہیں ہے۔

تو آخر تیمور لنگ نے بھارت میں ایسا کیا کیا تھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ انھیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے؟

پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر راجیو لوچن نے اپنے اس مضمون میں ان ہی پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

مؤرخین کا کہنا ہے کہ چغتائی منگولوں کے خان، تیمور لنگ کا بس ایک ہی خواب تھا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد چنگیز خان کی طرح ہی پورے یورپ اور ایشیا پر قبضہ کرلیں۔

چنگیز خان پوری دنیا کو ایک ہی سلطنت کے دائرے میں لانا چاہتا تھا تاہم تیمور لنگ کا ارادہ سلطنت سے زیادہ لوگوں پر دھونس جمانا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے فوجیوں کو اگر لوٹ کا کچھ مال مل جائے تو اور بھی اچھا۔

چنگیز خان اور تیمور لنگ میں ایک بڑا فرق تھا۔ چنگیز کے اصولوں کے مطابق فوجیوں کو کھلی لوٹ مار کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن تیمور کے لیے لوٹ مار اور قتل عام معمولی باتیں تھیں۔

تیمور لنگ جاتے جاتے ہمارے لیے اپنی ایک سوانح عمری بھی چھوڑ گئے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آخر ان تین مہینوں میں کیا ہوا تھا جب تیمور نے انڈیا پر حملہ کیا تھا۔ دنیا فتح کرنے کے چکر میں تیمور سنہ 1398 میں اپنی گھڑسوار فوج کے ساتھ افغانستان پہنچے۔ جب واپس جانے کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے سپہ سالاروں سے مشورہ کیا۔

دہلی پر تیمور کا حملہ

ہندوستان ان دنوں کافی امیر خطہ سمجھا جاتا تھا۔ بھارتی دارالحکومت دہلی کے بارے میں تیمور نے کافی کچھ سن رکھا تھا۔ اگر دہلی پر ایک کامیاب حملہ ہو سکا تو مال غنیمت میں بہت مال ملنے کی امید تھی۔ لیکن سپہ سالاروں نے تیمور کی اس

تجویز کو مسترد کر دیا۔

اس وقت دہلی کے شاہ نصیر الدین محمود تغلق کے پاس ہاتھیوں کی ایک بڑی اور مضبوط فوج تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی ٹک نہیں پاتا تھا۔ ساتھ ہی دہلی کی فوج بھی کافی بڑی تھی۔

تیمور لنگ نے کہا بس تھوڑے ہی دنوں کی تو بات ہے اگر زیادہ مشکل پڑی تو واپس آ جائیں گے۔ اور اس طرح منگولوں کی فوج دریائے سندھ پار کر کے ہندوستان میں داخل ہوگئی۔

راستے میں انھوں نے اسپندی نام کے ایک گاؤں کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ یہاں تیمور نے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانے کے لیے سبھی کو لوٹ لیا اور تمام ہندوؤں کے قتل کا حکم دیا۔

پاس میں ہی تغلق پور میں آگ کی پوجا کرنے والے ایذیدیوں کی آبادی تھی، آج کل ہم انہیں پارسی کہتے ہیں۔

تیمور لنگ کا کہنا تھا کہ یہ لوگ ایک غلط مذہب کے پیروکار ہیں اس لیے ان کے سارے گھر جلا ڈالے گئے اور جو بھی گرفت میں آیا اسے قتل کر دیا گیا۔ پھر تیمور کی فوج نے پانی پت کا رخ کیا۔ پنجاب کے سمانا قصبے، اسپندي گاؤں اور ہریانہ کے کیتھل میں ہوئے خون خرابے کی خبر سن کر پانی پت کے لوگ پہلے ہی شہر چھوڑ کر دہلی کی طرف فرار ہو گئے۔ پانی پت پہنچ کر تیمور نے شہر کو تہس نہس کرنے کا حکم دے دیا۔

راستے میں لونی کے قلعے سے راجپوتوں نے تیمور کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔ اب تک تیمور کے پاس تقریباً ایک لاکھ ہندو قیدی تھے۔ دہلی پر چڑھائی کرنے سے قبل اس نے ان سب کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

اس نے یہ بھی حکم صادر کیا کہ اگر کوئی فوجی بے قصور لوگوں کو قتل کرنے سے ہچکچائے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے۔

اگلے دن ہی دہلی پر حملہ کر کے نصیر الدین محمود تغلق کو آسانی سے شکست دے دی گئی۔ محمود ڈر کر دہلی چھوڑ کر جنگلوں میں جا چھپا۔

دہلی پر فتح کے بعد جشن مناتے ہوئے منگولوں نے کچھ خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تو لوگوں نے مخالفت کی۔ اس کے ردعمل میں تیمور نے دہلی کے تمام ہندوؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنے کا حکم دیا۔

چار دن میں سارا شہر خون سے لت پت ہوگیا

اب تیمور دہلی چھوڑ کر ازبکستان کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں میرٹھ کے قلعے دار الیاس کو بھی شکست دے کر تیمور نے میرٹھ میں بھی تقریباً 30 ہزار ہندوؤں کو قتل کروا دیا۔

یہ سب کرنے میں اسے محض تین ماہ لگے اور اس دوران دہلی میں وہ صرف 15 دن ہی رہا۔

❁❁❁

غزل

تیرا جوڑ گلاب نہیں کوئی
اِنج دا ہور شباب نیں کوئی

تیرے مُکھ تے تِل اے جہڑا
ایہدا یار جواب نیں کوئی

اس حسن نوں حسن نہ آکھو
جہدے لئی بیتاب نیں کوئی

تیری اَکھ اِچ اپنی مستی
اپنی مست شراب نیں کوئی

سجن ہوون تے سجناں نال
کردا فیر حساب نیں کوئی

اوہ حسن تے لوکاں لئی اے
جس تے شادؔ نقاب نیں کوئی

رانا محمد اکرم شادؔ

وبا کے بعد کی زندگی کیسی ہوگی؟

تحریر: یاسر پیرزادہ

آج سے ایک ماہ، تین ماہ، چھ ماہ یا ایک سال بعد جب یہ وبا ختم ہوگی تو اِس زمین پر بسنے والے انسان اپنی نئی زندگی کیسے شروع کریں گے؟ یہ وہ ملین ڈالر سوال ہے جو ہمارے مستقبل کا تعین کرے گا۔ اب سے تقریباً تین ارب نوّے کروڑ سال پہلے ایک چھوٹے سے خلیے سے شروع ہونے والی زندگی مسلسل ارتقائی عمل میں ہے اور یہ عمل تا قیامت جاری رہے گا۔

کب، کیسے، کہاں، کون سا خلیہ کیا شکل اختیار کر لے، ڈی این اے میں کون سا جین کب تغیر پذیر ہو جائے، کب کسی جرثومے کی جُون بدل جائے اور اِس کے نتیجے میں زندگی یکا یک کیا روپ دھار لے اور ہمیں کہاں پٹخ کر دے مارے، سوائے رب کے کوئی نہیں جانتا۔

ہماری اوقات کا اندازہ اِس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ زمین نامی جس سیارے میں ہم رہتے ہیں، اُس کا پتا اگر کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو سمجھانا پڑ جائے تو کچھ یوں بتائیں گے کہ جناب والا، اگر آپ اپنی کہکشاں سے ملکی وے کی طرف آئیں تو Sagittarius Arm میں کسی سے بھی ہمارے نظام شمسی کے بارے میں پوچھ لیں، وہاں سے زیادہ دور نہیں، یہی کوئی ایک یا دو کروڑ سال کے فاصلے پر ہے، نظام شمسی میں مریخ کی بغل میں جو چھوٹا سا سیارہ ہے وہی غریب خانہ ہے۔

چھ سات ارب کی آبادی ہے، آج کل گھر میں ذرا پریشانی چل رہی ہے، بیماری نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، کوشش کر رہے ہیں کہ جان چھوٹ جائے! اور اگر کائنات میں ایسی کوئی مخلوق ہوئی تو عین ممکن ہے کہ ہمیں یہ جواب دے کہ برخوردار، چھوٹا سا تمہارا گھر تھا، اتفاق سے اُس میں آکسیجن میسر تھی، پانی بھی وافر تھا، اچھی خاصی تمہاری گزر بسر ہو رہی تھی مگر تم نے تو وہ اُدھم مچایا کہ الامان الحفیظ، اپنے ساتھ ساتھ دوسرے جانداروں کا بھی جینا دوبھر کر دیا، اب بھگتو! مجھے یہ تو علم نہیں کہ اِس کائنات میں کوئی دوسری مخلوق بستی ہے یا نہیں لیکن انسان نامی مخلوق جو زمین پر آباد ہے اُس نے دیگر حیوانات کے مقابلے میں ناقابل بیان ترقی کی ہے اور ترقی کے اِس سفر میں انسان نے باقی جانداروں کو کچھ زیادہ عزت نہیں دی، کسی کو ہم پکا کر کھا جاتے ہیں تو کسی کو ابال کر سُوپ پی لیتے ہیں، کسی کی کھال ادھیڑ کر جوتی بنا لیتے ہیں تو کسی درخت کو کاٹ کر ڈرائنگ روم میں میز کی شکل دے دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ آج یہ تھیوری پیش کر رہے ہیں کہ انسان نے چونکہ اِس زمین پر قدرت کا توازن بگاڑ دیا تھا سو ’نیچر‘ اپنے قانون پر عمل کرتے ہوئے اِس توازن کو واپس لانا چاہتی ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو یا ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو۔ فی الحال مگر سوال یہ ہے کہ اِس وبا کے خاتمے کے بعد کا انسان کیسا ہوگا، وہ کس قسم کی زندگی گزارے گا اور یہ دنیا کیسی ہوگی؟ اگر یہ وبا آج سے دو لاکھ سال پہلے آئی ہوتی تو شاید اُس وقت کے انسان کی زندگی میں کوئی خاطر خواہ فرق نہ پڑتا، وہ ویسے ہی جنگلوں میں رہتا، اسی طرح پیڑ سے پھل توڑ کر کھاتا، حسبِ توفیق جانوروں کا شکار کرتا اور شام کو اپنی مادہ سے بالوں کی جوئیں نکلواتا (یا ’vice versa‘)۔ آج کا انسان ایسے نہیں جی سکتا، کچھ دیر کے لیے ہم ماسک پہن لیں گے، گھروں میں بھی بیٹھ جائیں گے، ایک دوسرے سے ملنے میں بھی احتیاط برتیں گے مگر بالآخر تنگ پڑ جائیں گے، ہمیشہ کے لیے یہ طرزِ زندگی شاید ہمیں قبول نہ ہو۔ آخر ہم نے ومبلڈن دیکھنا ہے، فٹ بال کھیلنا ہے، اولمپک منعقد کروانا ہیں، دنیا کی رنگینیاں سمیٹنی ہیں، ملکوں ملکوں گھومنا ہے، اپنے رب کے گھر بھی حاضری دینی ہے، زیارتیں کرنی ہیں۔

سب سے پہلی تبدیلی جس کے آثار ابھی سے نظر آنا شروع ہو گئے ہیں وہ ٹیکنالوجی کا استعمال ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گا۔ دو دن پہلے گوگل نے دنیا بھر کے ممالک کا ڈیٹا ویب سائٹ پر ڈالا جس سے پتا چلایا جا سکتا ہے کہ لاک ڈاؤن کے بعد لوگوں کی نقل و حرکت کس حد تک محدود ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ گوگل کے پاس ان معلومات کی رسائی ہے جو صارف کی نقل و حرکت سے متعلق ہیں، اِس سے اگلے مرحلے میں یہ ہوگا کہ حکومتیں اپنے شہریوں کی صحت کی حفاظت کی خاطر مزید ذاتی معلومات

تک رسائی حاصل کریں گی تا کہ مستقبل میں وبا کو پھوٹنے سے روکا جا سکے۔ایک آئیڈیا اِس خاکسار کے ذہن میں بھی آیا ہے کہ دنیا کی تمام حکومتیں عالمی ادارۂ صحت کے تعاون سے ایک ایسا مربوط ڈیٹا بیس تیار کریں جس میں وائرس سے متاثرہ اور صحت یاب ہونے والے لوگوں کا ڈیٹا ہو، انہیں ایک مخصوص نمبر دے دیا جائے جواُن کی شناخت ہو، ویکسین ایجاد ہونے کے بعد باقی لوگوں کو بھی اِس ڈیٹا بیس میں شامل کرلیا جائے جو اِس بیماری سے محفوظ تصور کیے جائیں، پھر اس ڈیٹا بیس کو موبائل ایپ کے ساتھ منسلک کر دیا جائے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ دنیا میں وائرس سے کتنی آبادی محفوظ ہے اور کتنی آبادی کو ابھی ویکسین کی ضرورت ہے۔ اِس ڈیٹا بیس سے عام لوگوں کو بھی پتا چل جائے گا کہ کسی اجتماع میں جانا محفوظ ہے یا نہیں، سفر کے دوران اذیت ناک اسکریننگ کی بجائے پاسپورٹ کے ساتھ صحت کا یہ نمبر بھی امیگریشن کاؤنٹر پر چیک کرلیا جائے کہ کہیں مسافر میں وائرس تو نہیں، بالکل ایسے جیسے کمپیوٹر میں اینٹی وائرس سافٹ ویئر ڈال کر کھنگالا جاتا ہے۔ انسان کی زندگی کس قدر بے معنی ہے یہ اِس وبا نے ایک مرتبہ پھر ہمیں سمجھا دیا ہے۔جب سب کچھ دوبارہ سے واپس آئے گا تو زندگی کے متعلق ہمارے رویے تبدیل ہو چکے ہوں گے، ہم ایک ایسی دنیا میں واپس آئیں گے جو بالکل نئی ہوگی جس میں یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ ’محفوظ مستقبل‘ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، آنے والا ہر لمحہ اگر آگہی کا سبب بنتا ہے تو ساتھ ہی ایک نامعلوم بلیک ہول کا در بھی کھول دیتا ہے۔ نا معلوم سے معلوم تک کا یہ سفر جاری رہے گا، انسان کی پیاس نہیں بجھے گی۔

❁❁❁

●●●●

ملک میں اس وقت رجسٹرڈ پرائیوٹ سکولز کی تعداد 2 لاکھ اوران میں پڑھانے والے ٹیچرز 15 لاکھ کے لگ بھگ ہیں۔ مالی، آیا، گارڈز اور کنٹین ورکرز اس کے علاوہ ہیں اگر Unregistered سکولز بھی شامل کر لیے جائیں تو ملازمین کی تعداد 20 لاکھ سے ہرصورت زائد ہے۔

اگر نجی سکولز نہ کھل سکیں گے تو والدین فیس جمع نہیں کروائیں گے جس کی وجہ سے ان ملازمین کی تنخواہیں جاری نہیں ہوسکیں گی۔

یہ وہ سفید پوش لوگ ہیں جو کسی سے نہیں مانگیں گے اور اپنی مشکل کسی کو کھول کے بتائیں گے بھی نہیں مجھے اور یہ راشن کے لیے کسی مسجد میں درخواست بھی جمع نہیں کروائیں گے میرے ایک دوست پرائیوٹ سکول کے استاد ہیں جن کی تنخوا لگ بھگ 20 ہزار ہے اوران کے 3 بچے سکول پڑھتے ہیں (اگر کوئی چھوٹا بچہ ہے تو مجھے نہیں معلوم) مکان بھی کرائے کا ہے۔

کل جمعہ کی نماز کے بعد اس ٹیچر کو کسی صاحب نے راشن گھر پہنچانے کا کہا تو صاف منع کر دیا یہ کہتے ہوئے چل دیے کہ کسی غریب تک پہنچائیے۔ میں بھی چونکہ وہاں موجود تھا اور اچھی طرح سے جانتا تھا یہ منظر دیکھ کر حیرت کے بہر لکاہل میں ڈوب گیا اور ابھی تک اس غریب اور خوددار ٹیچر کے جواب کی گونج سے باہر نہیں نکل سکا ہوں۔ میری حکومت سے دردمندانہ التماس ہے کہ ان 20 لاکھ ملازمین کا ضرور سوچا جائے۔مخیر حضرات سے بھی اپیل ہے کہ اس مشکل گھڑی میں ان خوددار پاکستانیوں کو نہ بھولیں۔

میرے خیال سے اس کا ایک حل یہ ہوسکتا ہے کہ ان نجی اداروں کو ضرورت کے مطابق بلاسود قرض جاری کیا جائے اور کراس چیک کیا جائے کہ تمام ملازمین کی تنخواہیں جاری کی گئی ہیں۔

دوسرا حل یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت ان سکول مالکان سے ڈیٹا لے کر کے ان ملازمین کو خود تنخواہ جاری کرے حکومت کچھ بھی کرے مگر فوری کرے۔ اگر نہیں تو پھر ایک قرنطینہ ایسا بنائیں جس میں خودداری، سفید پوشی اور بے روزگاری کے وائرس کی وجہ سے بھوک اور افلاس سے متاثرہ مریضوں کو رکھا جاسکے۔

●●●●

لاہور انٹرنیشنل رسالہ کی
توسیع اشاعت میں حصہ لینا
آپ کا قومی فرض ہے۔

شعبہ انٹرنیشنل

شہنشاہ جارج پنجم کی تعریف میں علامہ اقبال کا قصیدہ

تحریر: ابونائل

مشہور فلاسفر اور ریاضی دان برٹرنڈ رسل سے ایک انٹرویو کے آخر پر انٹرویو لینے والے نے سوال کیا کہ فرض کریں کہ آج سے ایک ہزار سال کے بعد لوگ اس انٹرویو کو سنیں تو مستقبل کے لوگوں کے لئے آپ کا کیا پیغام ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں مستقبل کی انسانیت کو دو پیغام دینا چاہوں گا۔ ایک تو عقل و دانش کا پیغام یہ دینا چاہوں گا کہ جب آپ کسی چیز یا فلسفے کا مطالعہ کر رہے ہوں تو اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ حقائق کیا ہیں اور حقائق سے کیا سچائی ظاہر ہوتی ہے؟

کبھی اپنی سوچ کا رخ اس طرف نہ مڑنے دیں کہ آپ کس چیز پر یقین کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ صرف یہ دیکھیں کہ حقائق کیا ہیں؟ اور اخلاقی پیغام یہ دینا چاہوں گا کہ محبت کرنا دانشمندی ہے اور نفرت کرنا بیوقوفی ہے۔ یہ دنیا اب ایک دوسرے سے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کو برداشت کرنا سیکھنا ہوگا۔ ہمیں اس حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا کہ کچھ لوگ ایسی باتیں کہیں گے جنہیں ہم پسند نہیں کرتے۔ یہ چیز اس سیارے پر انسانی زندگی کو جاری رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

اس کالم کو پڑھنے کے لئے ان دونوں مشوروں پر عمل کرنا ہوگا۔ بلاشبہ تاریخ میں علامہ اقبال کی شخصیت ایک قدآور شخصیت ہے۔ لیکن یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ جب ہم ایک شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں یا اس کے خلاف جذبات رکھتے ہیں تو اصل شخصیت کو بھول کر ایک فرضی شخصیت بنا کر اس پر اپنی محبت نچھاور کرنا شروع کر دیتے ہیں یا اسے اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ علامہ اقبال کے منسوخ شدہ کلام میں ایک طویل نظم بھی شامل ہے جو ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر ان کی تعریف میں لکھی گئی تھی۔ ایک اور قصیدہ کا ذکر مختلف کتابوں میں ملتا تھا جو کہ شہنشاہ جارج پنجم کی شان میں لکھا گیا تھا۔ اور ان کتب میں یہ قصیدہ نامکمل صورت میں درج ہے۔

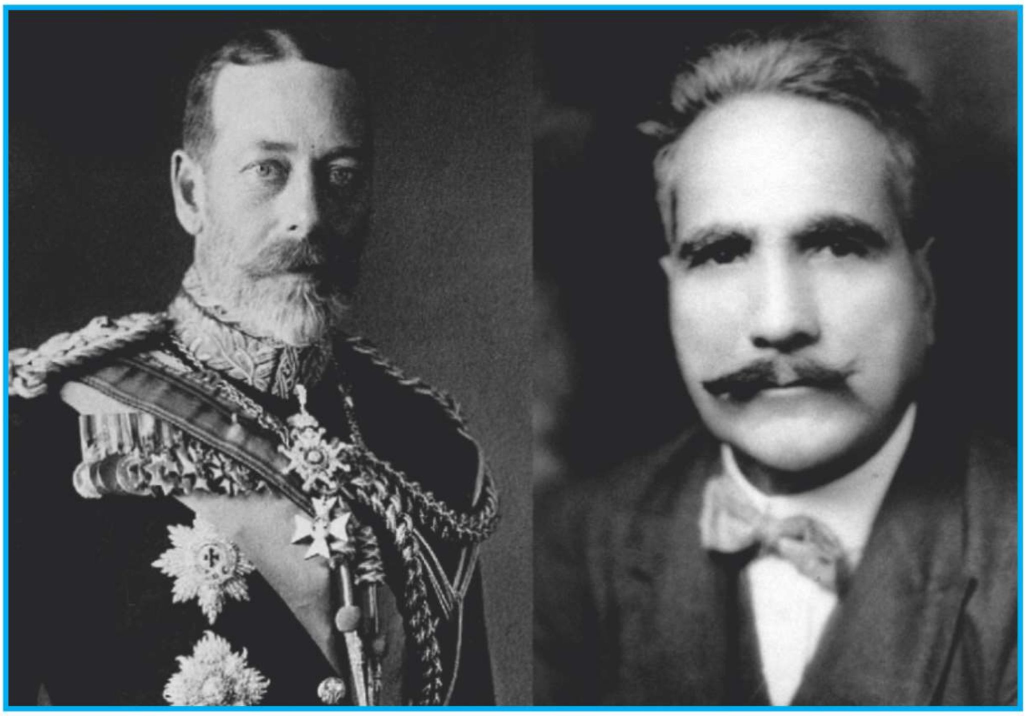

اس کے بارے میں "پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 5 مصنفہ زاہد چوہدری صاحب کے صفحہ 242 پر لکھا ہے کہ جب 1918 میں پورے پنجاب میں تحریک خلافت کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف تحریک چل رہی تھی اور حکومت فوجیوں کے لئے جبری بھرتی کر رہی تھی تو نواب ذوالفقار علی خان صاحب کے کہنے پر علامہ اقبال نے شہنشاہ جارج پنجم کو مخاطب کر کے ایک قصیدہ لکھا تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ جب یہ قصیدہ لکھا گیا تو اس وقت پنجاب پر مائیکل اوڈائر گورنر مقرر تھا۔

◆ مائیکل اوڈائر کے عہد میں ہی جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہوا تھا۔ اس قصیدہ کا عنوان "پنجاب کا جواب" تھا۔ اور علامہ اقبال نے یہ قصیدہ یونیورسٹی ہال میں ایک مشاعرے میں پڑھا تھا۔ یہاں ایک بات کی درستی ضروری ہے اور وہ یہ کہ تاریخی

طور پر پہلی جنگ عظیم کے دوران پنجاب یا ہندوستان سے جبری فوجی بھرتی نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ سب فوجی اپنی مرضی سے اچھی تنخواہ اور مراعات کے لئے فوج میں شامل ہوئے تھے۔ ان فوجیوں میں بڑی تعداد میں مسلمان بھی شامل تھے حالانکہ ترکی کی سلطنت عثمانیہ اس وقت برطانیہ کے خلاف جرمنی کے اتحادی کے طور پر شامل تھی۔

پھر زاہد چوہدری صاحب بغیر حوالے کے غلام رسول مہر صاحب کی کسی تحریر کا حوالہ دیتے ہیں کہ انہوں نے لکھا ہے کہ گورنر پنجاب مائیکل اوڈائر نے جنگی تنظیمات کے سلسلے میں دیگر تقریبات کے علاوہ مشاعرے بھی منعقد کرائے تھے۔ اور 1918 میں گورنر نے خاص طور پر علامہ اقبال سے نظم لکھنے اور مشاعرے میں آنے کی فرمائش کی تھی۔ زمانہ ایسا نازک تھا کہ اس فرمائش کو ٹالنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ چنانچہ علامہ اقبال نے یہ نظم لکھی اور مشاعرے میں خود جا کر پڑھی۔ اور یہ نظم اخبار وکیل میں بھی شائع ہوئی۔ اسی کتاب میں عبدالمجید سالک صاحب کی یہ روایت بھی درج ہے کہ اگر علامہ اقبال یہ نظم نہ لکھتے تو حکومت کی گرفت میں آجاتے اور نتیجہ بھی کچھ نہ نکلتا۔

اس کتاب میں یہ نظم نامکمل صورت میں تو درج ہے۔ لیکن کوشش تھی کہ علامہ اقبال کا لکھا ہوا یہ قصیدہ مکمل صورت میں دستیاب ہو جائے اور تصدیق بھی ہو جائے کہ علامہ اقبال نے اسے لکھا تھا کہ نہیں۔ چنانچہ برٹش لائبریری میں جائزہ لیا گیا۔ وہاں Sir Muhammad Iqbal Papers کے نام سے جو فائل موجود ہے، اس میں یہ قصیدہ مکمل اور شائع شدہ حالت میں موجود تھا۔ لیکن معین سال کا علم نہیں ہوسکتا۔ نیچے یہ الفاظ درج ہیں:

A poem in praise of King George V، by Sir Muhammad Iqbal-Lahore (1911)

ضروری نہیں کہ اسے پڑھ کر کوئی منفی رائے ہی قائم کی جائے۔ ایک تاریخی حقیقت کے طور پر اس کا مطالعہ کرنا کافی ہوگا۔

اعلیٰ حضرت ملک معظم کے پیغام کا جواب پنجاب کی طرف سے

از نتائج افکار جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

اے تاجدار خطہ جنت نشان ہند
روشن تجلیوں سے تیری خاوران ہند
محکم تیرے قلم سے نظام جہان ہند
تیغ جگر شگاف تیری پاسبان ہند
ہنگامہ وغا میں سر میرا قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو
تلوار تیری دہر میں نقاد خیر و شر
بہروز جنگ توز جگر سوز سینہ در
رایت تیری سپہر کا سرمایہ ظفر
آزادہ پرکشادہ پری زادہ یم سپر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے
آزادی زبان و قلم ہے اگر یہاں
سامان صلح دیر و حرم ہے اگر یہاں
تہذیب کاروبار امم ہے اگر یہاں
خنجر میں تاب تیغ میں دم ہے اگر یہاں
جو کچھ بھی ہے عطائے شہ محترم سے ہے
آباد یہ دیار تیرے دم قدم سے ہے
وقت آگیا ہے کہ گرم ہو میدان کارزار
پنجاب ہے مخاطب پیغام شہر یار
اہل وفا کے جوہر پنہاں ہوں آشکار
معمور ہو سپاہ سے پنہائے روزگار
تاجر کا زر ہو اور سپاہی کا زور ہو
غالب جہاں میں سطوت شاہی کا زور ہو
دیکھے ہیں میں نے سینکڑوں ہنگامہ نبرد
صدیوں رہا ہوں میں اسی وادی کا لورد
طفل صغیر میں ہی میرے جنگاہ میں مرد
ہوتے ہیں ان کے سامنے شیروں کے رنگ زرد
میں نخل ہوں وفا کا محبت ہے پھل میرا
اس قول سے ہے شاہد عادل عمل میرا
ہندوستان کی تیغ ہے فتاح ہشت باب
خونخوار لالہ باب جگر دار برق تاب
بے باک تابناک گہرپاک بے حجاب
دلبند۔ ارجمند۔ سحرخند۔ سیم ناب
یہ تیغ دلنواز اگر بے نیام ہو
دشمن کا سر ہو اور نہ سودائے خام ہو
اہل وفا کا کام ہے دنیا میں سوز و ساز
بے نور ہے وہ شمع جو ہوتی نہیں گداز

پردے میں موت کے ہے نہاں زندگی کا راز
سرمایہ حقیقت کبریٰ ہے یہ مجاز
سمجھو تو موت ایک مقام حیات ہے
قوموں کے واسطے یہ پیام حیات ہے
اخلاص بے غرض ہے صداقت بھی بے غرض
خدمت بھی بے غرض ہے اطاعت بھی بے غرض
عہد وفا مہر و محبت بھی بے غرض
تخت شہنشہی سے عقیدت بھی بے غرض
لیکن خیال فطرت انسان ضرور ہے
ہندوستان پہ لطف نمایاں ضرور ہے
جب تک چمن کی جلوہ گل پر اساس ہے
جب تک فروغ لالہ احمر لباس ہے
جب تک نسیم صبح عنادل کو راس ہے
جب تک کلی کو قطرہ شبنم کی پیاس ہے
قائم رہے حکومت آئین اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

نوسالہ عائشہ ایاز تائی کوانڈو چیمپیئن

میگزین ڈیسک

خیبر پختونخوا کے علاقے سوات سے تعلق رکھنے والی نوسالہ عائشہ ایاز نے متحدہ عرب امارات کی ریاست فجیرہ میں 31 فروری کو منعقد ہونے والے تائی کوانڈو کے بین الاقوامی مقابلوں میں انڈر 10 کیٹیگری میں گولڈ میڈل حاصل کر کے پاکستان کا نام روشن کردیا۔

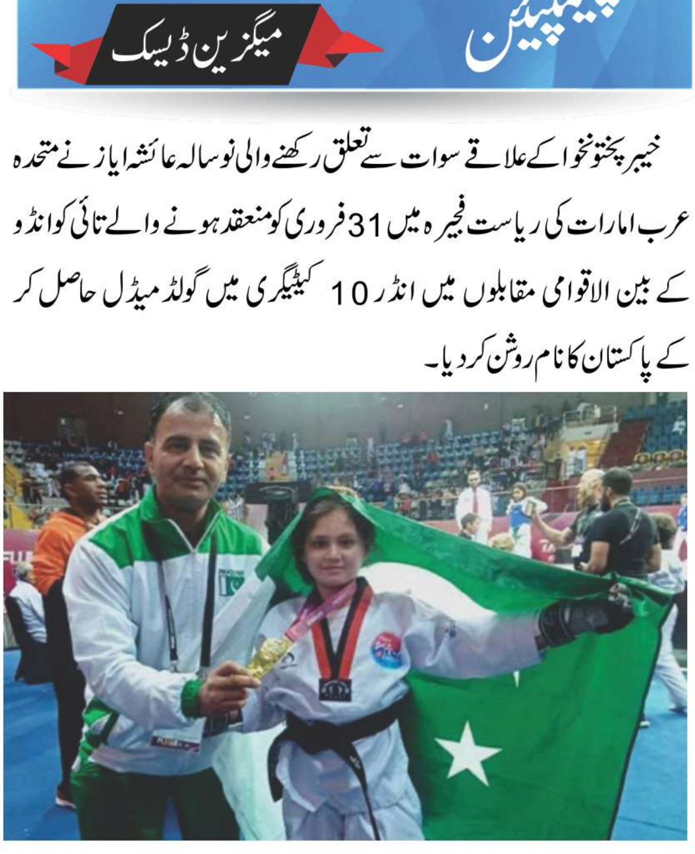

گذشتہ سال ان مقابلوں میں انہوں نے کانسی کا میڈل حاصل کیا تھا۔ اُس موقع پر عائشہ ایاز نے کہا تھا، کہ وہ سخت محنت کریں گی اور اگلے سال گولڈ میڈل حاصل کر کے اپنے والد کا خواب اور ملک کا نام روشن کریں گی۔

عائشہ نے کہا کہ 'جب میں فائنل کھیلنے لگی تھی تو میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ دنیا میں کوئی چیز بھی ناممکن نہیں ہے، بس ہمت ہونی چاہیے۔ وہ کہتی ہیں 'مقابلہ مشکل تھا۔ میرے ساتھ مقابلہ کرنے والی برطانوی لڑکی بھی سخت تھی۔ مقابلہ ختم ہونے سے دوراونڈ پہلے اس کے ساتھ میری ٹانگیں ٹکرا گئیں اور مجھے سخت تکلیف ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں پریشان ہوگئی کہ میں کھیل جاری رکھ بھی سکوں گی یا نہیں لیکن میں کھیلتی رہی۔' فائنل انتہائی جاندار تھا۔ مدِ مقابل لڑکی بھی بہت شاندار طریقے سے کھیل رہی تھی۔ جس نے بھی فائنل دیکھا، بہت تعریف کی۔ عائشہ کے مطابق راؤنڈ کے درمیانی وقفے میں انھوں نے اپنے والد اور کوچ محمد ایاز نائیک کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا، جب میچ ختم ہوا اور میری فتح کا اعلان ہوا تو اس وقت بھی میں نے چوٹ کا نہیں بتایا کیونکہ پاپا اور باقی ٹیم کے لوگ بہت خوش تھے۔ میں نے میڈل پہنا اور پھر اپنے والد کو بتایا کہ مجھے ٹانگوں میں سخت تکلیف ہورہی ہے۔'

عائشہ ایاز کے والد ایاز نائیک کا کہنا تھا کہ 'یہ تو میں جانتا تھا کہ عائشہ ایاز ایک بہترین کھلاڑی ہے، مگر مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ وہ اتنی حوصلہ منداور بہادر بھی ہے کہ زخمی ہونے کے باوجود بھی اس نے مقابلہ جاری رکھا اور مجھے بھی نہیں بتایا۔ پتا چلنے کے بعد میں اسے فوراً اسپتال لے کر گیا، جہاں پر اس کے ایکسرے ہوئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ کوئی بھی فریکچر نہیں تھا، مگر کچھ چوٹیں ضرور لگی تھیں۔''

عائشہ ایاز نے تقریباً تین سال کی عمر سے کھیلنا شروع کردیا تھا۔ تائی کوانڈو ان کا خاندانی کھیل ہے۔ یہ روزانہ تقریباً تین سے چار گھنٹے پریکٹس اور ورزش کرتی ہیں۔ ان کے والد کا کہنا ہے کہ اگر حکومت عائشہ پر تھوڑی سی توجہ دے تو مجھے امید ہے کہ پیرس میں ہونے والے 2024 کے اولمپکس میں یہ پاکستان کو گولڈ میڈل دلاسکتی ہے۔

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

مسولینی کی یرغمال سلطنت اور وبا کا سبق

تحریر: وجاہت مسعود

مولا علیؓ کا قول تو ہم سب نے سن رکھا ہے، میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ سے پہچانا۔ علی مرتضیٰ علم کے شہر کا دروازہ تھے۔ ہم کوتاہ قدم اور کم نظران کی بصیرت کی تھاہ کو کیا پہنچیں گے مگر ایسا ہے کہ ہم صدیوں کی پاکوبی میں ان گنت تجربات سے گزرے، واقعات کی بنتی بگڑتی ترتیب کا مشاہدہ کیا۔ تاریخ کا ہر چرکا ہمارے فگار دلوں کی لوح پر درج ہے۔ آنکھ کی پتلی میں فرد کی بے ثباتی اور تاریخ کے بے کنار سمندر کی کشمکش محفوظ ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ فرد اپنے محدود معروض کے تابع ہے۔ مطلق العنان فرد واحد ہو یا طالع آزماؤں کی ٹولی، اقتدار کے عزائم ایک مخصوص تناظر میں نمو پاتے ہیں اور واقعات کا ایک ناگزیر دائرہ مکمل کرتے ہوئے فراموشی کی دھند میں اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ہم جیسے بے چہرہ پیادے پرکاہ کی مانند منہ زور لہروں پر بہتے فنا کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔ کہیں صدیوں میں کوئی صاحبِ بصیرت نمودار ہوتا ہے کہ اپنے گیان کی وسعت کو خیال اور ہنر کی صورت دے کر آنے والی نسلوں کے لئے روشنی کا سامان کر دیتا ہے۔ کنفیوشس ایسا ہی ایک عبقری تھا۔ صدیوں بعد آنکھ ابن خلدون اور لیونارڈو ڈاونچی پر ٹھہرتی ہے۔ عمر خیام کی رباعیات محض سنگھار رس کی حکایت تھوڑی ہیں۔ آشوبِ زمانہ کے مقابل روحِ انسانی کی مقاومت کا رزمیہ ہیں۔ امیر خسرو نے اپنے کلام کے جس حصے کو انمل کا نام دیا، اس سے زیادہ مربوط تو علم ریاضی کا کوئی کلیہ نہیں ہو سکتا۔ اہل یورپ نے بیسویں صدی میں وجود کی معنویت اور لایعنیت کی بے مقدوری پر نظر کی۔ ابوالحسن امیر خسرو نے تیرہویں صدی میں بات نمٹا دی تھی، لا پانی پلا۔

ہمارے خسروئے وقت کسی قدر نازک مزاج واقع ہوئے ہیں۔ تیکھی بات کا یارا نہیں رکھتے۔ لکھنؤ کے نواب سعادت علی خان کی طرح دل میں بال آ جاتا ہے۔ اس غبار کو دور کرنے کے واسطے ایک طائفہ دشنام مرتب کر رکھا ہے۔ جہاں پناہ کے اشارے پر حرکت میں آنے والے ان مغبچوں کے بارے میں محمد حسین آزاد نے لکھ رکھا ہے کہ 'شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ بے نقط سناتے تھے کہ شیطان بھی امان مانگے'۔ صحافی غریب تو تہی کیسہ مخلوق ہے۔ قلم رکھتا ہے لیکن کلک نکتہ آفریں نادیدہ زنجیروں کی جکڑ میں ہے۔ تس پر ظلِ سبحانی فرماتے ہیں کہ اس ملک میں صحافت کو بے لگام آزادی میسر ہے۔ بجا فرمایا پیر و مرشد، نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ ازمنہ وسطیٰ کے ایک حاکم سے منسوب ہے کہ 'میری رعایا آزاد ہے اور اسے آزادی سے محبت کرنے کا حکم ہے'۔ اسی اشارہ غیبی سے تحریک پا کر آج طوطی ہند امیر خسرو کے اتباع میں کچھ انمل کہنے کا ارادہ ہے۔ تو چلیے بیسویں صدی کے اطالوی فاشسٹ ڈوچے مسولینی کا کچھ ذکر رہے۔

1942 کا موسمِ خزاں آتے آتے یہ بات کھل چکی تھی کہ جنگ کا دیوتا ماسکو کے برفیلے کیچڑ سے گزرتا ہوا اتحادیوں سے جا ملا ہے۔ اس ہزیمت میں جرمن فوج کے ہمراہ اطالوی سپاہ بھی شریک تھی۔ العالمین کے محاذ پر فیلڈ مارشل رومیل نے تاریخی جملہ کہا کہ جرمن فوج نے دنیا کو حیران کر رکھا ہے لیکن اطالوی سپاہیوں نے جرمن فوج کو ششدر کر دیا ہے۔ جنگیں مگر سپاہیوں کی بہادری سے نہیں، بہتر اسلحے، اہلِ عسکری کمان، مالی وسائل اور مدبر سیاسی قیادت کے بل پر جیتی جاتی ہیں۔ اٹلی کو شکست ہوئی۔ ادھر سسلی کے جنوبی ساحلوں پر اتحادی فوج اُتر آئی تھی۔ پے در پے شکست نے مسولینی کی آنکھوں میں وہ جوت ماند کر ڈالی جس نے کبھی اقبال کو مسحور کیا تھا۔ وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب...... بالآخر جولائی 1943 میں اطالوی پارلیمنٹ اور بادشاہ نے باہم گٹھ جوڑ سے مسولینی کو معزول کر کے نظر بند کر دیا۔ اتفاق سے مسولینی کو 25 جولائی کو گرفتار کیا گیا۔ براہِ کرم 25 جولائی کی رعایت سے توسن خیال کو مہمیز کرنے سے گریز فرمائیں۔ 12 ستمبر کو جرمن فوج کے ایک دستے نے مسولینی کو بازیاب کر کے ہٹلر کے حضور پیش کر دیا۔ ہٹلر نے از رہ خراج اپنا حصہ منہا کر کے باقی اٹلی پھر سے مسولینی کو سونپ دیا۔ سلطنتِ روما کی عظمتِ رفتہ کے احیا کا خواب دیکھنے والا مسولینی واپس روم پہنچا تو اٹلی کے ایک حصے پر پیٹن اور مونٹگمری دندنا رہے تھے۔ مسولینی کو اپنی کٹھ پتلی حیثیت کا پورا احساس تھا۔ مانگے تانگے کی اس حکومت میں مسولینی کی واحد مصروفیت اپنے مخالفین سے انتقام لینا تھی۔ جنوری 1945 میں اس نے ایک انٹرویو میں کہا کہ 'میں اب اس ناٹک کا کردار نہیں رہا۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اس پنڈال کا آخری تماشائی ہوں جو المیہ ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہے'۔ یہ المیہ 29 اپریل 1945 کو میلان کے ایک چوراہے میں اختتام پذیر ہوا۔

انمل کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ دوسرے حصے میں امریکی مصنف، جان ایم بیری (Barry.John M) کا تعارف کرانا ہے۔ صحتِ عامہ، قدرتی آفات اور وبائی امراض کے بارے میں پالیسی امور کے ماہر ہیں۔ 2004 میں The Great Influenza کے عنوان سے ایک شہرہ آفاق کتاب لکھی جس میں 1918 کے انفلوئنزا وائرس کی تفصیلی کیس ہسٹری کی مدد سے وباؤں کے موسم میں حکومتوں کے کردار کا تجزیہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ دو برس تک دنیا بھر میں تباہی پھیلانے والی اس وبا سے 50 کروڑ افراد متاثر ہوئے اور پانچ کروڑ اموات واقع ہوئی تھیں۔ دنیا کی کل آبادی تب دو ارب بھی نہیں تھی اور پانچ سالہ عالمی جنگ میں مرنے والوں کی کل تعداد دو کروڑ تھی۔ جان ایم بیری کہتے ہیں کہ وبائی امراض کے دوران عوام اور حکومت میں بامعنی تعاون کی ایک ہی صورت ہے کہ حکومت عوام سے سچ بولے۔ وبائی امراض پر قابو پانے کے لئے عوام کا حکومت پر اعتماد کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ امیر خسرو نے مسولینی کی یرغمال حکومت اور کورونا کی وبا میں ہمارے لئے ایک انمل رکھ دی ہے۔ ساکھ اور اعتماد تو اسمائے صفت ہیں۔ ہم تو موصوف کی تلاش میں ہیں۔

شعبہ انٹرنیشنل

کورونا وائرس: سماجی فاصلوں کا دورانیہ بڑھا تو زندگی کیسے تبدیل ہوگی؟

تحریر: زکریا ورک کینیڈا

اگر آپ کورونا وائرس کی وجہ سے باہر کی دنیا سے الگ تھلگ ہو کر رہ رہے ہیں تو آپ اکیلے نہیں ہیں۔ اِس وقت دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ لاک ڈاؤن میں رہ رہا ہے۔

دنیا بھر میں کروڑوں افراد اُن حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو کورونا وائرس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے لگائی گئی پابندیوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

لیکن اگر زندگی گزارنے کے ہمارے طریقوں میں یہ تبدیلیاں کافی عرصے تک رہیں تو کیا ہوگا؟

اِس مضمون میں جائزہ لیا گیا ہے کہ ہماری زندگی کے کچھ شعبے کس طرح تبدیل ہو سکتے ہیں۔

گھر سے کام

کاشتکاروں اور تعمیراتی کام کرنے والوں کے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ انھیں باہر جانا پڑتا ہے لیکن وہ لوگ جو ڈیسک پر کام کرتے ہیں اُن کا نیا دفتر اب گھر ہے۔

دنیا بھر میں کاروباری اداروں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ملازمین سے کہیں کہ وہ گھر سے کام کریں۔ ان میں ایپل اور مائیکرو سافٹ جیسی کمپنیاں بھی شام ہیں۔

ویسے تو گھر سے کام کرنے کا رجحان کورونا وائرس سے پہلے سے موجود ہے لیکن اب یہ معمول کی بات ہو سکتی ہے۔

آسٹریلیا کی بانڈ یونیورسٹی میں اداروں کے کام کے انداز کے ماہر لبی سینڈر کے مطابق آفس سے دور بیٹھ کر کام کرنے کو معمول بنانے میں کورونا وائرس ایک نقطۂ آغاز ہو سکتا ہے۔

سنہ 2019 میں لندن میں قائم کنسلٹینسی فرم انٹرنیشنل ورک گروپ کے سروے میں یہ بات سامنے آئی کہ دنیا بھر میں 60 فیصد سے بھی زیادہ اداروں کی پالیسی لچکدار ہے۔ لیکن اس تناسب میں مختلف ممالک کے درمیان بہت فرق ہے۔ جرمنی میں یہ 80 فیصد ہے تو جاپان میں صرف 32 فیصد ہے۔ انٹرنیشنل ورک گروپ کو توقع ہے کہ اداروں میں کام کے لچکدار انتظامات اور مضبوط ہوں گے اور جاری رہیں گے۔

گھر کے اندر رہنے والا طرزِ زندگی

اپنے آپ کو تنہا کرنے اور قرنطینہ میں رہنے کے تجربے سے ہماری تفریح کے طریقوں میں تبدیلیاں آ سکتی ہیں۔ مثلاً سینما جانا۔ ڈیٹا کا تجزیہ کرنے والی کمپنی اسٹیٹسٹا کے مطابق گزشتہ برس 56 کروڑ افراد سینما گئے تھے جو گزشتہ دو برسوں میں 18 فیصد اضافہ ہے۔

لیکن دنیا بھر میں سٹریمنگ پلیٹ فارم بھی بہت مقبول ہو رہے ہیں اور اسی عرصے میں صرف نیٹ فلکس کے صارفین کی تعداد 47 فیصد اضافہ کے ساتھ 16 کروڑ دس لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ اب جبکہ کورونا وائرس کی وجہ سے سینما بند ہو رہے ہیں تو امکان ہے کہ مزید لوگ نیٹ فلکس اور دوسری سٹریمنگ سروسز کی طرف جائیں گے۔

رجحانات کے ماہر بلیک مورگن نے بی بی سی کو بتایا کہ اٹلی اور اسپین میں نیٹ

فلیکس کا موبائل ایپ پہلی مرتبہ ڈاؤن لوڈ کرنے میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ اٹلی میں 57 فیصد جبکہ اسپین میں 34 فیصد اضافہ۔

اِس وقت لوگوں میں تفریح اور مسائل سے فرار ہونے کی خواہش میں ایسا اضافہ ہوا ہے جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

لیکن کیا گھر میں رہنے کے یہ رجحانات قائم رہیں گے؟

امریکی کنلسٹینٹ اور انٹرٹینمنٹ کی صنعت کے ماہر رچرڈ گرین فیلڈ سمجھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ افراد سٹریمنگ کی طرف جائیں گے اور امریکہ جیسے ممالک میں تھیٹر کے مالکان کے لیے سنگین مسائل پیدا ہوں گے۔

اخبار نیویارک ٹائمز سے بات کرتے ہوئے رچرڈ گرین فیلڈ کا کہنا تھا کہ رجحان تو پہلے ہی تبدیل ہو رہا تھا لیکن اب یہ بہت تیز ہوگا۔

میرے خیال میں اِس برس کے اختتام تک عالمی سطح پر انٹرٹینمنٹ کی نمائش کا کاروبار دیوالیہ ہوجائے گا۔

دوسری جانب گیمنگ کی صنعت کو بڑے منافع کی توقع ہے۔ چین میں گھروں میں قید رہنے کی وجہ سے گیمنگ کے صارفین میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ کئی شہروں میں ہونے والے لاک ڈاؤن کے بعد چین میں ایپل کے ایپ سٹور سے بڑی تعداد میں ویڈیو گیمز ڈاؤن لوڈ ہوئے ہیں۔

سفر اور سیاحت میں نئے رجحانات

کووڈ 19 نے سیاحت کی صنعت کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے سفر کے بارے میں ہمارے بنیادی تصورات بھی تبدیل ہو سکتے ہیں۔ ورلڈ ٹریول اینڈ ٹورازم کونسل کے مطابق اِس وباء کی وجہ سے دنیا بھر میں سیاحت سے منسلک پانچ کروڑ نوکریاں ختم ہو سکتی ہیں۔

انٹرنیشنل ایئر ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن کے اندازے کے مطابق اس سال عالمی سطح پر ہوابازی کی صنعت کو ایک 113 ارب ڈالر کا نقصان ہوسکتا ہے۔ یہ تخمینہ امریکہ کی جانب سے سخت قسم کی سفری پابندیاں لگائے جانے سے پہلے کا ہے۔

ایسوسی ایشن کا کہنا ہے کہ مارچ میں دنیا بھر میں 11 لاکھ فلائٹس کینسل کی گئیں اور بکنگ میں 50 فیصد کمی آئی جبکہ اپریل کی بکنگ میں 40 فیصد اور مئی کے لیے فلائٹ بکنگ میں 25 فیصد کمی ہوئی ہے۔

مقامی سطح پر کیے جانے والے اقدامات نے بھی سیاحت کی صنعت کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اِن اقدامات میں رضا کارانہ طور پر خود کو سب سے دور کر لینا اور عوامی اجتماعات پر پابندی بھی شامل ہے۔ سیاحت پر انحصار کرنے والے خطے مزید برے وقت کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے ہیں۔ لیکن کیا اِس بحران میں بہتری کا پہلو بھی ہے؟

ساؤتھ آسٹریلیا یونیورسٹی میں ٹورازم مینیجمنٹ کی پروفیسر فریا ہگنز کہتی ہیں کہ اِس وباء نے ہمیں ایک غیر متوقع اور قیمتی موقع فراہم کیا ہے۔

دنیا میں کئی ایسے علاقے ہیں جو ضرورت سے زیادہ سیاحت کا شکار ہیں اور جہاں مقامی افراد بہت زیادہ سیاحوں کی آمد سے خوش نہیں ہیں۔

پروفیسر فریا ہگنز سمجھتی ہیں کہ موجودہ بحران اس دلیل کے وزن میں اضافہ کرتا ہے کہ سیاحت کو معاشی ترقی کے لیے استعمال کرنے پر دوبارہ سوچ بچار کرنے کی ضرورت ہے۔

سائنسدان اِس جانب اشارہ کر چکے ہیں کہ انسانوں کی جانب سے ماحول، حیاتیاتی تنوع اور قدرتی وسائل کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کی وجہ سے اکثر وبائیں جنم لیتی ہیں۔

اگر ہم انسانی معیشتوں میں توازن اور حدود متعین نہیں کریں گے تو ایک کے بعد ایک بحران آتا رہے گا۔

آن لائن خریداری

دنیا بھر میں آن لائن شاپنگ اتنی عام نہیں ہے جتنی شاید آپ سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ ان علاقوں میں بھی بہت زیادہ نہیں ہے جہاں ہر طرف انٹرنیٹ موجود ہے۔ مثال کے طور پر سنہ 2019 کے اعداد و شمار کے مطابق یورپی یونین میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں میں سے 30 فیصد لوگوں نے آن لائن خریداری نہیں کی۔ لیکن 55 سے 74 برس کے لوگوں میں اب یہ شرح بڑھ کر 45 فیصد ہو گئی ہے۔

گھروں سے باہر نہ نکلنے کی وجہ سے صورتحال تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ یورو مانیٹر نامی تحقیقی ادارے کے مطابق آن لائن شاپنگ کے بارے میں عام لوگوں کا رویہ تبدیل ہو رہا ہے اور اس کا رجحان اس عمر کے لوگوں میں بھی بڑھ رہا ہے جو نئے تجربوں سے خائف رہتے ہیں۔

چین میں دس روز میں، جو جنوری کے اواخر اور فروری کے ابتدائی دن تھے، آن لائن کمپنی جے ڈی ڈاٹ کام پر خریداری میں 215 فیصد اضافہ ہوا۔

دنیا بھر میں جہاں بھی لاک ڈاؤن کیا جا رہا ہے وہاں امکان ہے کہ آن لائن خریداری کے اعداد و شمار ایسے ہی ہو جائیں گے۔

صاف ستھرا ماحول

سیٹلائٹ سے بنائے جانے والے تازہ تصاویر سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ چین میں ہوا میں آلودگی میں بڑی حد تک کمی آئی ہے۔ اِس کی وجہ کئی شہروں میں کیا جانے والا لاک ڈاؤن ہے جس کی بنا پر سڑکوں پر ٹریفک ہے نہ فیکٹریوں سے آلودہ دھواں نکل رہا ہے۔

صنعتی اور ٹریفک کی آلودگی میں کمی کا مطلب ہے کہ ملک میں گرین ہاؤس گیسوں کا اخراج واضح طور پر کم ہوا ہے۔

لیکن جیسے ہی دنیا معمول پر واپس آئے گی آلودگی کی پرانی سطح بھی واپس آ جانے کا خدشہ پوری طرح موجود ہے۔

لیکن آب و ہوا میں تبدیلی اور عالمی حدت میں اضافے کے خلاف کام کرنے والے کارکنوں کو موجودہ صورتحال میں بہتری کا موقع دکھائی دے رہا ہے۔

سٹینفرڈ یونیورسٹی کے تحقیق کار مارشل برک نے اپنے تازہ بلاگ میں لکھا ہے کہ انسانی سرگرمیوں میں بڑے پیمانے پر خلل پڑنے اور اس سے باقاعدہ طور پر بڑے اور جزوی فائدے ہونے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے معمول کے کاموں کے طریقوں میں بھی ایسے ہی خلل کی ضرورت ہے۔

مارشل برک نے یہ حساب لگایا کہ چین میں ہوا کے معیار میں اس وقتی یا عارضی بہتری نے پانچ سال سے کم عمر چار ہزار بچوں کی زندگی بچائی ہے اور 73 ہزار ایسے لوگوں کو بچایا ہے جن کی عمر 70 برس سے زیادہ ہے۔ یہ تعداد چین میں کورونا وائرس سے مرنے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ چین میں کورونا وائرس سے تین ہزار سے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے ہیں۔

اگر ہم کووڈ 19 سے بچ جاتے ہیں تو یہ وائرس ایسے طریقوں کو ڈھونڈنے میں ہماری مدد کر سکتا ہے کہ ہم کم سے کم آلودگی پیدا کر کے اپنے کام کس طرح کریں۔

آپ کو ای ڈاکٹر دیکھے گا

روایتی طریقۂ کار سے مختلف طور پر صحت کی سہولیات پہچانے کے لیے ٹیلی مواصلات اور ورچوئل ٹیکنالوجی کا استعمال ٹیلی ہیلتھ کہلاتا ہے۔

کوورنا وائرس کے وباء کے تناظر میں مرض کی تشخیص اور علاج کے لیے ٹیلی ہیلتھ کا استعمال مزید اہم ہو گیا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت نے بھی اِس رجحان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ماہرین سمجھتے ہیں کہ اس طریقے سے اخراجات میں کمی ہو گی اور صحت کی سہولیات تک رسائی میں اضافہ ہو گا۔

امریکہ کی ویسٹ ورجینیا یونیورسٹی میں صحت عامہ کی پالیسی کے ماہر اسٹیوڈیوس کے مطابق ٹیلی ہیلتھ خود ساختہ قرنطینہ میں مددگار بن کر وائرس کے پھیلاؤ کو روکنے میں بھی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ جبکہ اِس کے ذریعے بیماریوں کو علاج بھی جاری رہ سکتا ہے۔

یہ طریقہ کورونا وائرس کو روکنے کی امریکی حکومت کی کوششوں کا حصہ بن چکا ہے۔

صدر ٹرمپ نے 17 مارچ کو نیشنل ہیلتھ انشورنس کے نظام میں جن تبدیلیوں کا اعلان کیا تھا ان کے تحت ٹیلی ہیلتھ کو بزرگوں اور زیادہ خطرے کے شکار لوگوں کے لیے میسر کر دیا گیا ہے۔

محمد بن سلمان کے بادشاہ بننے میں کیا رکاوٹیں ہیں

لاہور انٹرنیشنل نیوز ڈیسک

سعودی ولی عہد محمد بن سلمان اپنے والد کے بعد بادشاہت کا تاج اپنے سر پر سجانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ مستقل طور پر کام کر رہے ہیں۔ لیکن یہ راستہ خطرات سے خالی نہیں ہے اور محلاتی سازشوں کا نتیجہ خوفناک نکل سکتا ہے۔ اگر سعودی عرب میں ابھی تک موجود تخت نشینی کے قوانین کی بات کی جائے تو ولی عہد محمد بن سلمان کو بادشاہ بننے کی اجازت نہیں ہوسکتی۔ اس حوالے سے دو قانون اہم ہیں، ایک اصول سینیئر ہونا ہے، دوسرا اصول السعود خاندان کی کونسل کا اتفاق ہے۔ چونتیس سالہ ولی عہد ہر حال میں اپنے چوراسی سالہ والد سلمان بن عبدالعزیز السعود کی جگہ بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ سعودی تخت نشینی کے دونوں قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ پورے سعودی عرب کا استحکام داؤ پر لگا رہے ہیں۔

اگر محمد بن سلمان اپنی منزل اور مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، جیسا کہ نظر بھی آ رہا ہے، تو انہیں ہر اُس شخص کو راستے سے ہٹانا ہوگا، جو 'سینیارٹی' کے اصول کے مطابق تخت اور تاج کا زیادہ مستحق ہے۔ انہیں السعود خاندان کے ہر اُس شخص کے خلاف کارروائی کرنا ہوگی، جو ان کے سامنے کھڑا ہوگا۔ خاندانی کونسل 2007 میں اس وقت کے شاہ عبداللہ نے قائم کی تھی تا کہ کسی بادشاہ کے انتقال کے بعد اقتدار کی منتقلی پرامن طریقے سے ہو سکے۔

محمد بن سلمان سعودی عرب کا شاہ بننے کے لیے تنازعات سے گریز بھی نہیں کرتے۔ سن 2017 میں انہوں نے اُس وقت کے ولی عہد محمد بن نایف کو نہ صرف معزول کیا بلکہ انہیں نظر بند بھی کر دیا تھا۔ نومبر 2017 میں انہوں نے بدعنوانی کے پردے کے پیچھے متعدد کاروباری شخصیات، جن میں کئی شہزادے بھی شامل تھے، کو ایک ہوٹل میں بند کر دیا تھا۔ اور اکتوبر 2018 میں ان کے ناقد صحافی جمال خاشقجی کو استنبول میں واقع سعودی قونصل خانے میں قتل کر دیا گیا تھا۔

ابھی تک محمد بن سلمان سب کچھ بلا خوف وخطر کرتے آئے ہیں۔ وائٹ ہاؤس میں ان کے خاص دوست ڈونلڈ ٹرمپ ہیں، جو ان کے ہر کام کو تسلیم کرتے آئے ہیں۔ ایک ہفتہ قبل محمد بن سلمان نے دوبارہ کارروائی کی ہے۔ ڈیمینشیا میں مبتلا ان کے والد اور بادشاہ کی صحت مزید خراب ہوگئی ہے۔ دوسری جانب ابھی تک یہ بھی واضح نہیں ہے کہ آیا نومبر میں ٹرمپ دوبارہ انتخابات جیت پائیں گے۔ دریں اثناء محمد بن سلمان کے سب سے بڑے حریف شہزادہ احمد نے گزشتہ ماہ بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پرنس احمد، شاہ سلمان کے چھوٹے بھائی ہیں اور خاندانی کونسل کے اہم رکن بھی ہیں۔ پرنس احمد کے مطابق السعود خاندان کے قوانین کے مطابق تخت اور آئندہ بادشاہت کے جائز وارث وہ ہیں۔

السعود خاندان میں ولی عہد محمد بن سلمان کے سب سے بڑے نقاد بھی پرنس احمد ہی ہیں۔ وہ خاندانی کونسل کے ان تین افراد میں شامل تھے، جنہوں نے محمد

بن سلمان کے ولی عہد بننے کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ وہ عوامی سطح پر بھی محمد بن سلمان کی سیاست پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ السعود خاندان میں انہیں استثنٰی حاصل ہے۔لیکن محمد بن سلمان نے نہ صرف انہیں بلکہ کئی دیگر شہزادوں کو بھی گرفتار کرلیا ہے۔

مملکت سعودی عرب کی تاریخ میں غیر معمولی اقدام نے ہمیشہ دو مقاصد انجام دیے ہیں۔ ایک ممکنہ حریفوں کو دیوار سے لگا دیا گیا اور دوسرا شاہی خاندان کی تمام شاخوں کو سخت ترین پیغام پہنچایا گیا۔ اب سعود خاندان کی کونسل میں ولی عہد محمد بن سلمان کی مخالفت کم ہوگی۔ ہر کسی کو محمد بن سلمان کی وفاداری کا حلف اٹھانا ہوگا اور ان کے ہاتھ اس قدر طاقتور ہو جائیں گے، جس کی ماضی قریب میں مثال نہیں ملتی۔ چونکہ فوج، قومی محافظ دستے اور خفیہ ادارہ بھی ان کے ماتحت ہوگا، لہذا ان کی اجازت کے بغیر کسی شہزادے کو کوئی طاقت نہیں مل سکے گی۔ محمد بن سلمان نے پچھلے پانچ برسوں میں اپنی طاقت میں مسلسل توسیع کرتے ہوئے اپنی ایک منقسم تصویر بنائی ہے۔ ایک طبقے کے لیے وہ جدت پسند ہیں، جو قدامت پرستوں کی بنائی ہوئی مذہبی بیڑیوں کو اتارتے ہوئے ثقافتی اصلاحات کے ذریعے خواتین اور نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی فراہم کر رہے ہیں۔ دوسرے طبقے کے لیے وہ اپنے ناقدین اور انسانی حقوق کے کارکنوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج رہے ہیں۔ تاہم ان کا 'وژن 2030' اس وقت تک کامیاب نہیں ہوگا، جب تک انہیں اکثریتی عوام کی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ اگر اصلاحات کی ٹرین پٹڑی پر نہیں آتی اور طویل المدتی بنیادوں پر تیل کی قیمتیں کم رہتی ہیں تو یہ صورت حال خود محمد بن سلمان کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی۔ بالکل انہی شہزادوں کی طرح، جنہیں وہ خود راستے سے ہٹا چکے ہیں۔ تبصرہ: رائنر ہیرمان، فرانکفرٹر الگمائنے سائٹنگ DW ❁❁❁

عید کا چاند تم نے دیکھ لیا
چاند کی عید ہو گئی ہو گی
دیکھا ہلال عید تو آیا تیرا خیال
وہ آسماں کا چاند ہے تو میرا چاند ہے

لندن میں کسیر صلیب کانفرنس میں شرکت، قبولیت دعا کا ایمان افروز واقعہ

منور علی شاہد (جرمنی) مکرم اعجاز احمد صاحب حال مقیم مانچسٹر یو کے، ضلع لاہور سے تعلق رکھتے ہیں، جب آپ قائد خدام الاحمدیہ ضلع لاہور تھے، تب میں ان کی مجلس عاملہ میں نائب معتمد ضلع ہوا کرتا تھا، مجھے یاد ہے کہ لاہور میں قیام کے دوران آپ کو متعدد تاریخی مواقع پر خدمت کی سعادت ملتی رہی تھی، جرمنی کے ایک جلسہ سالانہ پر آپ سے طویل عرصہ بعد جب ملاقات ہوئی تو لاہور کی بہت سی باتیں ہوئیں تھیں اور اس وقت بھی ان سے یہی استدعا کی تھی کہ آپ اپنی یاداشتوں کو کہیں شائع کرائیں تا کہ احباب جماعت بھی مستفید ہوسکیں اور محفوظ بھی ہو جائیں گی اور میں ان یاداشتوں کی ڈرافٹنگ اور کمپوزنگ میں مدد کردوں گا۔ محترم اعجاز صاحب نے از راہ شفقت یہ سلسلہ شروع کیا تو یہ دوسرا مضمون ہے جو اعجاز احمد صاحب کی یاداشتوں پر مشتمل ہے۔ لندن میں منعقدہ صلیب کانفرنس میں شرکت بارے آپ نے ایک سچے واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے زیرو وسائل کے باوجود معجزانہ رنگ میں حضور کی مسلسل دعاؤں کے نتیجہ میں تاریخی کانفرنس میں شرکت کی توفیق ملی تھی۔ مکرم اعجاز احمد صاحب لکھتے ہیں کہ۔۔۔۔ ایک دن خاکسار چوہدری فتح محمد صاحب نائب امیر لاہور کے پاس کسی کام سے گیا تو انہوں نے ذکر کیا کہ حضرت صاحب لندن میں کسر صلیب کانفرنس منعقد کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں، غالبا جون کے شروع میں، لہذا جو احباب اپنے اخراجات پر جانا چاہیں جا سکتے ہیں اور ویزے بھی خود لگوانے ہونگے۔ چند دنوں بعد ان احباب کی درخواستیں آنا شروع ہوگئیں جو کانفرنس میں جانا چاہتے تھے، ان میں زیادہ تر کاروباری افراد تھے یا پھر وکیل۔ تقریبا مارچ کے درمیان میں خاکسار (اعجاز احمد) کچھ درخواستیں لے کر امیر صاحب کے پاس گیا کہ ان میں سے جن کو اجازت ہے وہ تیاری شروع کرسکیں۔ اس موقع پر چوہدری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم نے درخواست دی ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں، کیونکہ ایک تو میرے مالی حالات اتنے اچھے نہیں ہیں اور دوسرا ویزہ لگنے کی شرائط بہت سخت ہیں جن کو پورا کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے، ایمبیسی والے بنک بیلینس، پراپرٹی کے کاغذات سمیت بہت کچھ مانگتے ہیں جو کہ میرے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ امیر صاحب نے کہا کہ تم حضور کو خط لکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کردو۔ دو ہفتوں بعد حضور کا مجھے جواب ملا کہ" آپ دعائیں کریں خدا تعالیٰ

ضرور مدد کرے گا‘‘۔ خاکسار نے وہ خط مکرم امیر صاحب کو دیا تو انہوں نے کہا کہ تم ویزہ کے لئے درخواست جمع کرادو، اگر ویزہ لگ گیا تو اخراجات کا بعد میں دیکھ لیں گے۔ پھر میں نے ویزہ فارم منگوایا اور اس میں مانگے گئے کوائف میں سے کسی ایک کا جواب مثبت میں میرے پاس نہیں تھا، ماسوائے ایک سرکاری نوکری کے خط کے جس میں تنخواہ 450 روپے ماہانہ تھی، میں نے نام پتہ، تاریخ پیدائش وغیرہ لکھ کر فارم ایمبیسی بھیج دیا، 30 اپریل تک مجھے کوئی کال وصول نہیں ہوئی، میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا چونکہ ہر کوئی یہی کہتا تھا کہ ان کوائف پر تم کو ویزہ نہیں مل سکے گا۔ لوگ تیاری کر رہے تھے اور میں مایوس بیٹھا تھا۔ ایسے میں مجھے ایک دن اچانک ایمبیسی سے انٹرویو کال آگئی، میں خوش ہونے کی بجائے مایوس ہو گیا اور سوچا کہ انٹرویو کے لئے نہ ہی جاؤں تو بہتر ہے، اس دوران میں ہر ہفتہ حضور کی خدمت میں دعا کے لئے خط لکھتا رہتا تھا اور ہمیشہ یہی جواب آتا کہ دعائیں اور کوشش جاری رکھیں خدا تعالیٰ ضرور مدد کرے گا۔

ایک دن میں نے چاروں خطوط سامنے رکھے تو ایک لفظ تواتر کے ساتھ لکھا تھا ’’دعائیں کریں اور کوشش جاری رکھیں، خدا تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا‘‘ اس نے مجھے بہت حوصلہ دیا اور میں خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر انٹرویو دینے اسلام آباد چلا گیا، یہی سوچ رکھا تھا کہ ویزہ لگ تو تو بتادوں گا ورنہ خاموش رہونگا۔ جب اسلام آباد ایمبیسی میں پہنچا تو وہاں بہت لمبی لائن لگی ہوئی تھی، میری باری تین بجے کے قریب آئی میں دعائیں کرتا ہوا اندر گیا تو ایک عورت اکیلی بیٹھی ہوئی تھی، اس نے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی سوالات کی بوچھاڑ کردی، میرے پاس بنک بیلنس، پراپرٹی سے متعلق سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا میں نے اسے صرف یہ کہا کہ میری سرکاری نوکری ہے، بیوی بچے میرے یہاں پاکستان میں ہیں، میری جماعت کے خلیفہ لندن میں ایک مذہبی کانفرنس کے لئے جا رہے ہیں اور میرا مقصد بھی اس کسر صلیب کانفرنس میں شرکت کرنا اور آپ کے ملک کی سیر کرنا ہے، مجھے صرف دو ہفتوں کا ویزہ چاہیئے، اگر مناسب سمجھیں تو دے دیں ورنہ میرا پاسپورٹ واپس کردیں۔ اس عورت نے اسی وقت میرا پاسپورٹ اور کاغذات مجھے واپس کر دیئے اور میں خاموشی سے دروازے کھول کر باہر نکل گیا، باہر نکلتے ہی اچانک ایک آواز پیچھے سے آئی میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی عورت تھی اس بغیر کچھ کہے میرا پاسپورٹ مجھ سے لیا اور چھ ماہ کا ویزہ لگا کر پاسپورٹ مجھے واپس کر دیا۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا، واپس ہوٹل میں آکر شکرانے کے نفل ادا کئے اور رات کو واپس لاہور پہنچ گیا۔

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے
اے میرے فلسفیو ، زور دعا تو دیکھو

اگلے دن میں مکرم چوہدری حمید نصر اللہ خان امیر صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا تو مجھ سے پوچھا کہ کل کہاں غائب رہے تھے؟ میں نے کہا کہ میں ویزہ لگوانے گیا تھا اور لگ گیا ہے، وہاں بیٹھے کسی کو بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ میرا ویزہ لگ گیا ہے، سب مزاق سمجھ رہے تھے، میں نے پاسپورٹ نکال کر سب کو ویزہ دکھایا سبھی حیران رہ گئے تھے کیونکہ امیر لوگوں کے ویزوں کی درخواستیں مسترد ہوگئیں تھی۔ میں نے سب کو بتایا کہ میں نے اس دوران حضور کی خدمت میں چار خطوط لکھے تھے اور چاروں کے جواب میں حضور نے یہی لکھا تھا کہ ’’دعائیں کریں اور کوشش جاری رکھیں خدا تعالیٰ ضرور مدد کرے گا‘‘ میں نے کہا کہ یہ ہوئی خدائی مدد۔ اس کے بعد ٹکٹ وغیرہ کا مسئلہ تھا، اس موقع پر مکرم محمود احمد صاحب صدر مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کو بھی بتادیا تھا کہ میں کانفرنس میں شرکت کرنا چاہتا ہوں، مکرم امیر صاحب نے مکرم محمود احمد صاحب صدر مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ اور دیگر احباب سے مشورہ کے بعد مجھے مجلس خدام الاحمدیہ لاہور کا نمائندہ بنا کر لے جانے کی اجازت دے دی اور یوں میرا یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور پھر مجھے نمائندہ خدام الاحمدیہ لاہور بنا کر کانفرنس میں بھیجا گیا تھا۔ اس طرح مجھے وفد کے ساتھ لندن جانے اور کسر صلیب کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس کسر صلیب کانفرنس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کے علاوہ حضرت صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب نے بھی خطاب کیا۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ کسر صلیب کانفرنس بہت کامیاب رہی تھی جس میں تمام مذاہب کے no نمائندگان نے شرکت کی تھی۔ کانفرنس میں حضور کے علاوہ حضرت سر محمد ظفر اللہ خان صاحب، مکرم صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب، محترم شیخ عبد القادر صاحب محقق اور ڈاکٹر پروفیسر عبد السلام صاحب سمیت لاہور کے بہت سے احباب نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔

جماعت احمدیہ لاہور کے چند احباب کسرِ صلیب کانفرنس کے موقع پر لندن میں

کیا بنی نوع انسان کے لیے یہ آخری صدی ہے؟

کیا انسانوں کا وہی حشر ہونے والا ہے جو ڈائنوسارز کا ہوا تھا؟

انسانی نسل کو فی الحال ماحولیاتی تبدیلی، ایٹمی جنگ، وبائی امراض یا پھر زمین کے ساتھ شہابی پتھروں کے ٹکرانے جیسے خطرات لاحق ہیں۔

ریڈیو براڈ اسٹر اور فلسفی ڈیوڈ ایڈ منڈس نے ان امور کے ماہرین سے بات کی اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا رواں صدی کے آخر تک کرۂ ارض سے انسان کا وجود مٹ تو نہیں جائے گا؟

سب سے بڑا خطرہ کیا ہے؟

آکسفورڈ کے فیوچر آف ہیومنٹیز انسٹی ٹیوٹ کے محقق اینڈرس سینڈبرگ کا کہنا ہے کہ بنی نوع انسان کے سامنے معدوم ہونے کا ایسا خطرہ ہے جو پوری کہانی ہی ختم کر دے گا۔

20 ویں صدی تک ہمارا یہ خیال تھا کہ ہم بہت ہی محفوظ جگہ آباد ہیں لیکن اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔

شہابیوں سے ٹکرانے کا خطرہ

سنہ 1980 کی دہائی تک ہمارا یہ خیال نہیں تھا کہ آسمان سے برسنے والے شہابیے سے زمین پر کوئی بڑی تباہی آئے گی لیکن رواں دہائی میں سائنسدان باپ بیٹے لوئی اور والٹر ایوار یز نے ایک تصور پیش کیا کہ شہابیوں کی وجہ سے زمین سے ڈائنوسار ختم ہو گئے۔

میکسیکو کی خلیج کے یوکٹان میں ایک بڑے گڑھے کی دریافت کے بعد سائنسدانوں کے ایک بین الاقوامی پینل نے حال ہی میں اس خیال کی حمایت کی ہے۔

بہر حال شہابیوں کے ٹکرانے کا امکان ابھی نہیں ہے لیکن ہم خود ہی مختلف اقسام کے خطرات پیدا کر رہے ہیں۔

آبادی میں اضافہ، وسائل کا خاتمہ اور موسمیاتی تبدیلی

موسمیاتی تبدیلی کے خطرات سے ہم بہت حد تک آشنا ہیں لیکن لندن یونیورسٹی کی ریسرچر کیرن کلھیمین آبادی میں اضافے پر تحقیق کر رہی ہیں۔

کم ہوتے قدرتی وسائل کی خبروں کے ساتھ اس کا ذکر ہم اس لیے نہیں کرتے کیونکہ ہم اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتے۔

کیرن کے مطابق جن چیزوں سے انسانی آبادی اجتماعی قبر میں دفن ہو سکتی ہے ان میں موسمیاتی تبدیلی اور آبادی میں اضافہ کا مشترکہ مسئلہ بھی شامل ہے۔

ان کے مطابق آبادی میں اضافے کا آب و ہوا کی تبدیلی پر خاص اثر ہے کیونکہ وسائل ختم ہو رہے ہیں اور ان کا استحصال بڑھ رہا ہے اور یہ آب و ہوا کی تبدیلی کو مزید خوفناک صورت فراہم کرتا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ اگر آبادی میں اضافہ رک بھی جائے اس کے باوجود موسمیاتی تبدیلی کو روکنا ناممکنات میں شامل ہے۔

حیاتیاتی تنوع کی تباہی

کچھ محققین کا کہنا ہے کہ اس صدی کے وسط تک کاروباری ماہی گیری کی صنعت کے لیے سمندر میں وافر مچھلیاں نہیں ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دکانوں میں خریدنے کے لیے کوئی مچھلی، چپس یا فش کری نہیں ہوگی۔

کیڑے مکوڑے بھی تیزی سے ناپید ہو رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی چڑیوں کی کئی اقسام بھی ختم ہو رہی ہیں کیونکہ ان کی خوراک وہ کیڑے مکوڑے ہیں جو اب نہیں رہے۔

کرین کا کہنا ہے کہ ہم حیاتیاتی تنوع کے ختم ہونے کے نتائج سے لاعلم ہیں لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے خاتمے سے ہماری زندگیوں پر برے اثرات مرتب ہونے والے ہیں۔

وبا

کیمبرج کے سینٹر فار ایگزسٹنشیئل رسک سے منسلک للتھا سندرم حیاتیاتی

خطرات کا مطالعہ کر رہی ہیں۔

وہ کہتی ہیں کہ سنہ 1918 میں ہسپانوی بخار کی وبا کے دوران ایک اندازے کے مطابق تقریباً آدھی آبادی اس کی زد میں آ گئی تھی اور اس سے پانچ سے دس کروڑ افراد کی موت ہوئی تھی۔

وبائی امراض اس وقت پھیلتے ہیں جب بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوتی ہے۔ اس وقت بھی لوگوں کو جنگلوں سے واپس بھیجا جا رہا تھا اور وہ ڈربے نما کمروں میں رہ رہے تھے۔ اگرچہ ہم ویکسین تیار کرنے میں زیادہ مہارت حاصل کر چکے ہیں لیکن عالمی سطح پر وبا کے خطرات ہیں۔

ہسپانوی فلو کے دوران لوگ ٹرینوں اور کشتیوں سے سفر کرتے لیکن فضائی سفر کے اس دور میں وبا کے تیزی سے پھیلنے کا خدشہ ہے۔

سرپھروں سے خطرہ

انسانوں کی پیدا کردہ زیادہ تر تباہی کے پس پشت کوئی مقصد کارفرما نہیں ہوتے لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں تباہ کن حملوں کے خطرات بڑھ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر سنتھیٹک بیالوجی کے استعمال سے لیب میں مہلک وائرس بنانا۔

فیوچر آف لائف انسٹی ٹیوٹ میں محقق فل ٹوریس کے مطابق اگر کوئی تباہی لانے والا بٹن ایجاد کر لیا جائے تو اس بٹن کو دبا کر تباہی مچانے والے لوگوں کی کمی نہیں۔

یہ بٹن دبانے والے سخت گیر مذہبی ہو سکتے ہیں جنھیں اس بات پر یقین ہو کہ انھیں خدا کی طرف سے دنیا کو تباہ کرنے کا حکم موصول ہوا ہے تاکہ اسے بچایا جا سکے۔ جیسا کہ جاپان میں ہوا تھا۔

فل کے مطابق ایسے لوگوں سے بھی خطرہ ہے جو انسانوں کی تباہی کی اپنی ہی توجیح رکھتے ہوئے عوامی مقامات پر اندھا دھند گولی باری کرتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جو عوامی یا نجی سطح پر سب کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن ان کی تعداد کیا ہوگی؟ ایک تخمینہ کے مطابق، دنیا میں نفسیاتی امراض کے شکار افراد کی تعداد تین کروڑ ہو سکتی ہے اور ان میں سے کوئی بھی خطرہ بن سکتا ہے۔

ایٹمی جنگ

ایٹمی جنگ ہمیں مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتی ہے لیکن اس کے دور رس اثرات سے ہم ختم ہو سکتے ہیں۔

گلوبل کیٹاسٹروفک رسک انسٹی ٹیوٹ کے سیتھ بام کے خیال سے ایٹمی دھماکے کے نتیجے میں غبار فضا میں بہت اونچائی تک جا سکتا ہے۔ یہ غبار کئی دہائیوں تک وہاں رہ سکتا ہیں اور سورج کی روشنی کو روک سکتا ہے۔

ایٹمی جنگ کے نتیجے میں بہت بڑے پیمانے پر تباہی کا ہونا، معاشی رکاوٹیں اور آخر میں عالمی ماحولیات پر برے اثرات مرتب ہونا ہیں۔

مصنوعی انٹیلیجنس

مصنوعی خطرات بہت اقسام کے ہو سکتے ہیں۔ کمپیوٹر کے حساب کتاب میں کسی حادثے کے نتیجے میں گڑبڑ پیدا ہونے سے پوری دنیا کی سٹاک مارکیٹ ختم ہو سکتی ہے اور معیشت تباہ ہو سکتی ہے۔

لیکن ماہرین ایک چیز کے متعلق بہت فکرمند ہیں وہ ڈیپ فیک ویڈیو ہے جس میں کسی مشہور شخص کی فوٹیج کے ساتھ اس طرح چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے کہ وہ چھیڑ چھاڑ کرنے والے کی خواہش کے مطابق ایسا کچھ کرتا یا کہتا نظر آئے جیسا وہ چاہتا ہے۔ مشتبہ ایجنٹ اس کے ذریعے دو ممالک میں جنگ کروا سکتے ہیں جو ایٹمی جنگ کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ یہ تکنیک پہلے سے ہی موجود ہے اور اب اصل اور جعلی کے درمیان کا فرق مٹتا جا رہا ہے۔

ڈوڈو چڑیا کی نسل اب معدوم ہو چکی ہے

یہ خطرات کیسے کم ہو سکتے ہیں؟

ایسے میں ہماری تہذیب و تمدن کو کس قدر سنگین صورت حال کا سامنا ہے؟ اس کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ کس خطرے کے بارے میں بات کی جا رہی ہے۔

خیال رہے کہ مستقبل پتھر پر لکھی ہوئی کوئی عبارت نہیں ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جو ہم کر سکتے ہیں اور اب وقت عملی اقدام کا ہے۔

لیکن کیرن کا خیال ہے کہ آبادی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

وہ کہتی ہیں خاندان کے سائز سے منسلک سماجی اطوار کو بدلنے کی ضرورت ہے اور اس رویے کو چھوڑنا ضروری ہے کہ ہم جتنے بچے چاہیں پیدا کریں اور جو چاہیں کھائیں۔ اس طرح ہم عالمی تباہی کو روکنے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

احتیاطی تدابیر کے اقدامات کے معاملے میں انسانوں کا ریکارڈ بہت خراب رہا ہے اور ہمارے ادارے مستقبل کی نسل کے حق میں بہت زیادہ فکرمند نظر نہیں آتے۔

لیکن کیرن کا کہنا ہے کہ 21 ویں صدی بنی نوع انسان کی بقا کے لیے آخری ثابت نہ ہو اس کے لیے ہمیں ان خطرات کو زیادہ سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے۔

(بشکریہ بی بی سی)

رمضان المبارک اور اس کی برکات

رمضان المبارک اپنی پوری برکتوں کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ اس مبارک مہینہ میں خدا تعالیٰ اپنے خاص افضال اور برکات نازل فرماتا ہے۔ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے اور ان کی حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا فرماتا ہے اور انہیں قربِ خاص سے نوازتا ہے۔

روزہ اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ روزہ عبادت ہے جس سے انسانی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے روزہ کی اہمیت کے سلسلہ میں یہ امر بھی بیان فرمایا ہے کہ سارے مذاہب اور تمام شرائع میں روزہ فرض ہوتا رہا ہے۔ گویا روزہ سارے مذاہب کی ایک مشترکہ اور بنیادی عبادت ہے۔ اسلام میں جو روزہ کی شکل ہے وہ کامل ہے اور اس سے کامل روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ تندرست اور مقیم ہونے والے ہر بالغ مرد اور عورت پر فرض ہے کہ وہ رمضان کے مہینہ میں طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے وغیرہ سے اجتناب کرے۔ خدا کے حکم کے مطابق دن بھر بھوکا اور پیاسا رہے اور ذکر الٰہی میں مشغول رہ کر دن بسر کرے۔ اس طرح روزہ داروں کو احساس ہوگا کہ ان کے غریب بھائی سال بھر کس طرح بھوک کی سختیاں برداشت کرتے ہیں۔ ان میں محتاجوں کے لئے ہمدردی پیدا ہوگی اور وہ اپنے بنی نوع بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کی طرف خاص طور پر توجہ کریں گے۔ اس عمدہ احساس کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کے ترک سے ان کی روحانی قوتوں میں بیداری پیدا ہوگی اور وہ روح کی طرف زیادہ توجہ دے سکیں گے۔ انہیں پتہ چلے گا کہ جس طرح کھانے اور پینے کے بغیر جسم کا بقاء ناممکن ہے اسی طرح روحانی غذا کے بغیر روح کی زندگی اور نشوونما بھی ممکن نہیں۔ اسی طرح روزہ اجتماعی اور انفرادی طور پر بہت سی برکات لاتا ہے۔ رمضان المبارک سے اسلامی معاشرہ میں ایک پاک تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے اور ایک ماہ کی یہ روحانی تربیت سال بھر کے لئے عموماً روحانی خوراک کا کام دیتی ہے۔ چونکہ سحری کے لئے عورتیں اور مرد اٹھتے ہیں اس لئے رمضان کے ایام میں نماز تہجد کا اہتمام بھی آسانی سے ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اسی طرح مسلمان پنجوقتہ نمازوں کے علاوہ رمضان کے مبارک مہینہ میں تہجد کی نماز کی برکات سے بھی عام طور پر مستفید ہوتے ہیں۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اس نے ایک طرف فطرتی قویٰ کی روحانی طاقتوں کو ابھارنے کے لئے مختلف عبادتیں مقرر فرمائی ہیں تو دوسری طرف یہ حکم بھی دے دیا ہے کہ کسی انسان پر اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نا قابل برداشت حد تک پہنچ جائے نہیں ڈالا جائے گا۔ اس لئے جو لوگ رمضان میں مسافر ہوں یا بیمار ہوں ان کو ان ایام میں روزہ رکھنے سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ شریعت کی دی ہوئی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا عین مناسب ہے مگر دین کی سہولتوں کے باوجود جو لوگ فرض روزہ نہیں رکھتے وہ سخت گنہگار ہیں۔ انہیں اس زندگی کے بعد سخت افسوس ہوگا کہ ہم نے قیمتی موقع ضائع کردیئے۔ پس مومنوں کا فرض ہے کہ ہر قسم کی افراط وتفریط سے بچتے ہوئے شریعت اسلامی کے قانون کی پیروی میں رمضان المبارک کے روزے رکھ کر اس بابرکت مہینہ کی برکتوں سے وافر حصہ حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دے۔ آمین

غیر مسلم اور قانون توہینِ رسالت

تحریر: ابنِ قدسی

دوسری قسط

جن آیات سے یہ سمجھا کہ ان سے شان میں گستاخی کرنے والوں کی سزا ثابت ہوتی ہے وہاں پر ہی ان تمام آیات کو چھوڑ دیا گیا ہے جہاں پر شان میں گستاخی کرنے والوں کا ذکر تو ہے مگر ان کی سزا بیان نہیں کی بلکہ اس کے برعکس صبر کا مضمون بیان کیا گیا۔ استہزاء اور ہنسی کرنے والوں کا ذکر ہے مگر إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ (الحجر:۹۶) کہ یقینا ہم استہزاء کرنے والوں کے مقابل پر تجھے بہت کافی ہیں کہہ کر صبر کرنے کا پیغام دیا۔ عبد اللہ بن ابی بن سلول رئیس المنافقین نے ایسا گستاخانہ فقرہ کہا جسے کوئی بھی مسلمان برداشت نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر موجود ہے

يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (المنافقون: ۹)

کہ مدینہ کا سب سے معزز شخص یعنی عبد اللہ بن ابی بن سلول نعوذ باللہ نعوذ باللہ مدینہ کے سب سے ذلیل شخص یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ سے نکال دے گا۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا مگر اس کی سزا کا کوئی ذکر نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کے علم میں بھی تھا مگر کسی نے بھی عبداللہ بن ابی بن سلول کو قتل نہیں کیا بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے فوت ہونے پر اس کا جنازہ پڑھانے تشریف لے گئے۔ اور اسے اپنا کرتہ پہنایا۔

انبیاء کی تکذیب اور مخالفت کا پورے قرآن کریم میں بار بار ذکر ہے۔ اس مخالفت کے جواب میں صبر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور مخالفین انبیاء کے استہزاء اور تمسخر کے مقابل پر خدا تعالیٰ نے اپنی ذات کو بیان کیا ہے۔

ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا كُلَّ مَا جَاءَ أُمَّةً رَّسُولُهَا كَذَّبُوهُ (المومنون:45)

ترجمہ: پھر ہم نے پے در پے اپنے رسول بھیجے جب بھی کسی امت کی طرف اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلا دیا

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوّاً مِّنَ الْمُجْرِمِينَ وَكَفَى بِرَبِّكَ هَادِياً وَنَصِيراً (الفرقان:32)

ترجمہ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے مجرموں میں سے دشمن بنا دئے ہیں۔

كَذَلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ (سورۃ الذاریات:53)

ترجمہ: اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کی طرف بھی کبھی کوئی رسول نہیں آیا مگر انہوں نے کہا کہ یہ ایک جادوگر یا دیوانہ ہے

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُون (سورۃ الزخرف:8)

ترجمہ: اور کوئی نبی ان کے پاس نہیں آتا تھا مگر وہ اس کے ساتھ تمسخر کیا کرتے تھے۔

يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلاَّ كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُون (سورۃ یسین:31)

ترجمہ: وائے حسرت بندوں پر ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا مگر وہ اس سے ٹھٹھا کرنے لگتے ہیں

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُون (سورۃ الانبیاء:42)

ترجمہ: اور رسولوں سے تجھ سے پہلے بھی تمسخر کیا گیا پس انکو جنہوں نے ان رسولوں سے تمسخر کیا انہی باتوں نے گھیر لیا جس سے وہ تمسخر کرتے تھے

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَى مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّى أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلاَ مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّهِ وَلَقَدْ جَاءكَ مِن نَّبَإِ

الْمُرْسَلِينَ (سورۃ الانعام:35)

ترجمہ: اور یقینا تجھ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے گئے تھے اور انہوں نے اس پر کہ وہ جھٹلائے گئے اور بہت ستائے گئے صبر کیا یہاں تک کہ ان تک ہماری مدد آن پہنچی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ Oفَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ Oوَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُO(سورۃ الحجر:98تا100)

ترجمہ: اور یقینا ہم جانتے ہیں کہ تیرا سینہ ان باتوں سے تنگ ہوتا ہے جو وہ کہتے ہیں پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا اور اپنے رب کی عبادت کرتا چلا جا یہاں تک کہ تجھے یقین آ جائے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (سورۃ النمل:71)

ترجمہ: اور ان پر غم نہ کر اور کسی تنگی میں مبتلا نہ ہو اس کے باعث جو وہ مکر کرتے ہیں

فَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ (سورۃ یسین:77)

ترجمہ: پس تجھے ان کی بات غم میں مبتلا نہ کرے یقینا ہم جانتے ہیں جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ(سورۃ الاعراف:200)

ترجمہ: عفو اختیار کر اور معروف کا حکم دے اور جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کر۔

وَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْراً جَمِيلاً(سورۃ المزمل:11)

ترجمہ اور صبر کر اس پر جو وہ کہتے ہیں اور ان سے اچھے رنگ میں جدا ہو جا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيماً حَكِيماً(سورۃ الاحزاب:2)

ترجمہ: اور ان کافروں اور منافقوں کی ایذا رسانی کو نظر انداز کر دے اور اللہ پر توکل کر اور اللہ ہی کارساز کے طور پر کافی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَاباً مُّهِيناً (سورۃ الاحزاب:58)

ترجمہ: یقینا وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں اللہ نے ان پر دنیا میں بھی لعنت ڈالی ہے اور آخرت میں بھی اور اس نے ان کے لئے رسوا کن عذاب تیار کیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات کا خلاصہ یہی ہے کہ انبیاء کی مخالفت ہوتی ہے ان سے استہزاء اور تمسخر تو کیا جاتا ہے مگر ان کو صبر کرنے کی تعلیم دی جا رہی ہے اور معاملہ خدا کے سپرد کرنے کا کہا جا رہا ہے۔ اب یہ آیات ہیں جن میں استہزاء کے جواب میں صبر کی تعلیم ہے دوسری طرف بقول علامہ صاحب قرآن کریم میں ان تمسخر کرنے والوں کو قتل کی سزا دینے کی تعلیم ہے۔ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ یہ کہے کہ ہم استہزاء کرنے کے مقابل پر تیری طرف سے کافی ہیں اور دوسری طرف ان کی گردنیں کاٹنے کی تعلیم ہو۔ ایک طرف تو رسول کریم ﷺ کھلی کھلی گستاخی کرنے والے سے حسن سلوک فرمائیں اور فرماتے چلے جائیں اور دوسری طرف یہ تعلیم بھی ہو کہ گستاخی کرنے والے کے لیے کوئی رعایت نہیں اور اس کی سزا قتل ہے۔ ان متضاد تعلیمات سے کیسے ایک وقت میں عمل کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے وہ علماء حضرات جو توہین رسالت کے مرتکب کو قتل کی سزا کو شرعی سزا بتا رہے ہیں ان کو اپنے اس موقف پر دوبارہ غور کرنا چاہیے۔ یہ بات تحریر کرتے ہوئے قطعاً قطعاً نعوذ باللہ رسول کریم ﷺ کی توہین کرنے کو جائز قرار نہیں دیا جا رہا بلکہ رسول کریم ﷺ کی حرمت کو قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ رحمۃ للعالمین، محسنِ انسانیت، فخر رسلؑ تمام دنیا کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ آپ کے مشن کی تکمیل اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ساری دنیا آپ کی امت میں داخل ہو۔ لوگوں کے دلوں میں تبدیلی پیدا ہو اور وہ دل و جان سے خدا اور رسول کی محبت میں فنا ہو جائیں۔ اور یہ محبت نرمی اور خوش اخلاقی سے پیدا کی جا سکتی ہے نہ کہ قتل اور سزا کا قانون بنا کر۔ خدانخواستہ اگر کوئی توہین کرنے والا ہے بھی تو اس کے سامنے رسول کریم ﷺ کی تعلیمات کا حقیقی چہرہ بیان کیا جائے تو یقینا اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ اور اپنی غلطی سے توبہ کر لے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ غیر ہمارے ہر عمل کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں اگر ہم دنیا کے سامنے یہ تعلیم رکھیں کہ اسلام ہر وقت اپنے ہاتھ میں تلوار لیے کھڑا ہے تو غیر اسلام سے ڈرنے تو لگیں گے مگر اسلام اور بانی اسلام سے محبت کبھی نہیں کریں گے۔

جب ہم ''توہین رسالت'' کہتے ہیں اس میں ''رسالت'' سے مراد تمام انبیاء

مراد ہیں نہ کہ صرف آنحضرت ﷺ ۔ کیونکہ رسالت تو اس مرتبہ کا نام جو خدا کی طرف سے اپنے برگزیدہ لوگوں کو عطا ہوتا ہے اور برگزیدہ لوگ گمراہی میں ڈوبی انسانیت کو ہدایت کے راستے پر چلاتے ہیں۔ اب اگر ہم اپنے رسول ﷺ کی حرمت کو قائم رکھنے کا یہ ذریعہ سمجھتے ہیں کہ کوئی قانون بنایا جائے تو دیگر انبیاء کی طرف منسوب امتوں کا حق بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ جس رسول کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں ان کی حرمت کو قائم رکھنے کے لیے کوئی قانون بنا لیں اور بنا بھی اسی طرح کا لیں جس طرح کا ہم نے بنا رکھا تو خود سوچیں دنیا میں کیا ہو جائیگا۔ سب سے پہلے تو تبلیغ کا کام ختم ہو جائیگا۔ پھر کوئی کسی کو یہ کہہ کر قتل کر سکتا ہے کہ ہمارے بانی کو جس حیثیت سے ہم مانتے ہیں اس طرح تسلیم نہیں کیا گیا۔

اکثر علماء کی طرف سے یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ اگر کسی کے والد کی اس کے سامنے بے عزتی کی جائے تو وہ کبھی کسی صورت میں اسے برداشت نہیں کرتا تو ہم رسول کریم ﷺ کی بے عزتی کس طرح برداشت کریں۔ ایک لحاظ سے ان کی بات درست ہے کہ انسانی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے جس سے گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی عزت پر حرف آنا کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک بچے کے کھلونے کو نقصان پہنچایا جائے تو وہ بچہ بھی احتجاج کرے گا۔ اسلام تمام فطرتی جذبات کو اعتدال اور کنٹرول میں لانے کا نام ہے۔ جہاں محبت کو بھی جائز اور صحیح جگہ رکھا جائے تو وہاں غصہ و ناراضگی کو بھی کنٹرول کرنا چاہیے۔ ایسا نہیں کہ جہاں مرضی اور جب مرضی اور جیسے مرضی ان جذبات کا اظہار ہو۔ باپ اور بیٹے کا آپس میں ایک رشتہ ہوتا ہے اس رشتہ اور تعلق کی وجہ سے محبت ہوتی ہے۔ اگر کوئی باپ کی بے عزتی کرے تو اس رشتہ اور محبت کی وجہ سے بیٹے کے لیے یہ برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے باپ بھی اس بات پر خوش ہو کہ میرا بیٹا میرے لیے غیرت رکھتا ہے لیکن وہ باپ کبھی بھی خوش نہیں ہوگا جس کے دونوں بیٹے آپس میں لڑ پڑیں اور ایک دوسرے کو قتل کردے۔ اگر ایک بیٹا دوسرے بیٹے کے سامنے باپ سے بے ادبی کرے تو باپ کبھی پسند نہیں کرے گا کہ دوسرا بیٹا تلوار پکڑ کر پہلے کی گردن اڑا دے۔ بلکہ باپ اس بات پر فخر محسوس کریگا اگر دوسرا پہلے کو سمجھا کر باپ کے ادب پر قائل کرلے۔ باپ کی خاطر کسی سے لڑنا باپ کو خوش کر سکتا ہے مگر باپ کی خاطر بھائی سے لڑنا باپ کے لیے تکلیف کا باعث بنے گا۔ آنحضرت ﷺ تو ساری دنیا کی طرف مبعوث ہوئے اور سارے انسانوں کی اصلاح آپ کے ذمہ تھی۔ جس انسانیت کو آپ ﷺ سیدھے راستے پر ڈالنے آئے تھے اسے ختم ہوتا دیکھ کر آپ کسی صورت میں خوش نہیں ہونگے۔ آپ یہ کبھی پسند نہیں فرمائیں گے کہ آپ کے نام پر ایک دوسرے کو قتل کیا جائے۔ آپ کی کامیابی تو یہ ہے کہ سب آپ کے عاشق بنیں۔ اس لیے ہمیں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے یہ سوچ لینا چاہیے کہ کہیں ہماری محبت لوگوں کے دلوں میں رسول کریم ﷺ سے دوری تو پیدا نہیں کر رہی۔ باپ بیٹے کا تعلق ایک ذاتی معاملہ ہے مگر رسول کریم ﷺ سارے انسانوں کے رسول ہیں اس لیے بڑا سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔

باپ بیٹے کے حوالے سے ایک واقعہ کا ذکر بھی اہم ہے۔ عبداللہ بن ابی بن سلول کا ذکر ہو چکا ہے جب اس نے رسول کریم ﷺ کی شان میں گستاخی والے کلمات کہے تو خیال پیدا ہوا کہ اب اسے سزا دی جائے گی۔ عبداللہ کا بیٹا ایک مخلص مسلمان تھا۔ وہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول اگر میرے باپ کی سزا قتل ہے تو مجھے اجازت دیجئے میں اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کو قتل کروں تاکہ کل کو میرے دل میں کوئی بدلہ لینے کا خیال پیدا نہ ہو لیکن رسول کریم ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اگر گستاخ رسول کی سزا قتل ہوتی تو یقینا یہ وہ موقعہ تھا جہاں یہ سزا دی جاسکتی تھی۔ اور اس کی گستاخی کوئی معمولی نہیں تھی کیونکہ قرآن کریم نے اس کا ذکر کر دیا ہے مگر پھر بھی آپ نے اسے قتل کی سزا نہیں دی۔ بیٹے کی بات میں ہمارے لیے ایک انتہائی پیغام ہے جسے سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس نے کہا کہ میں اپنے ہاتھوں سے قتل کروں تاکہ کل کو میرے دل میں کسی سے بدلہ لینے کا خیال پیدا نہ ہو۔ بے شک گستاخی کی بنا پر بطور سزا ہی میرے باپ کو قتل کیا گیا پھر بھی دل میں تو باپ کی محبت ہے وہ کبھی جوش مار سکتی ہے اور میں اپنے باپ کے قاتل (جو یقینا رسول کریم ﷺ کا کوئی صحابی اور آپ کا عاشق ہوگا) کے مقابل پر اٹھ کھڑا ہوں گا۔ گویا مقتول کے وارثوں کا بدلہ لینا ایک طبعی تقاضا ہے اور اس کا کسی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں بدلہ لینے کا خیال ہو وہاں بغض وعناد تو ہوسکتا ہے محبت کسی صورت میں پیدا نہیں ہوسکتی۔ گستاخی کی وجہ سے قتل ہونے والے کا باپ، ماں، بھائی، بہن، بیوی، بیٹا اور بیٹی کیسے اسلام کے سچے عاشق بن سکتے ہیں۔ قتل ہونے کی بجائے اگر گستاخی کرنے والا ان سب کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے سچا عاشق رسول ﷺ بنے تو یہ چیز تو ان سب کو اسلام کی طرف یقینا راغب کرے گی۔ قتل سے خوف رسول ﷺ تو پیدا ہوسکتا ہے محبت رسول ﷺ نہیں۔ لیکن ہماری زندگی کا مشن خوف رسول ﷺ پیدا کرنا نہیں بلکہ

حب رسول ﷺ پیدا کرنا ہونا چاہیے۔

''توہین رسالت'' کی شرعی سزا قتل بیان کی جاتی ہے۔لیکن استدلال کرنے والے یقینا جانتے ہونگے کہ قرآن کریم اور شریعت نے جب بھی تعزیرات کو بیان کیا ہے تو پوری تفاصیل سے بیان کیا ہے۔واضح احکامات دیے ہیں شرائط بیان کی ہیں۔زنا، قذف، چوری وغیرہ ان جرائم کی سزائیں بیان ہوئیں مگر اس کے ساتھ گواہوں وغیرہ کی شرائط لگائی گئی ہیں۔اسے بھی قاضی کے پاس لے جایا جائے گا پھر فیصلہ ہوگا۔''توہین رسالت'' سزا قتل بیان تو کی جاتی ہے مگر اس جرم کو ثابت کرنے کی شرائط بیان نہیں کی جاتی۔تحقیق، گواہ وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔سب سے بڑی بات یہ کہ توہین کی ہی کوئی تعریف نہیں بیان کی گئی۔رسول کریم ﷺ کی توہین کا دیگر مذاہب کے حوالے سے کیا بیان کریں مسلمانوں کے فرقے ایک دوسرے پر توہین رسولؐ کا الزام لگائے ہیں۔نور و بشر، حاضر و ناظر اور عالم الغیب جیسی بحثوں میں الجھ کر ایک دوسرے پر گستاخ رسولؐ ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ایسی صورت میں توہین کی کیا Defination بیان کریں۔یہ بڑا اہم سوال ہے۔

پھر ایک اور پہلو سے ایک اہم بات یہ ہے کہ گستاخی کی سزا تو اسے ملے گی جو لوگوں کے سامنے گستاخی کرے گا اگر کوئی اکیلے میں یا تنہائی میں رسول کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کردے گا اسے کیا سزا ملے گی۔پھر جن ممالک میں توہین رسالت کا قانون نہیں بنا ہوا کیا وہاں توہین کرنے والا بچ جائے گا۔اس لیے خدا نے فرمایا کہ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ (الحجر:۹۶) کہ استہزاء کرنے والوں کے مقابل پر تیری طرف سے ہم ہی کافی ہیں۔

یہاں پر اب ان روایات پر بھی تبصرہ ضروری ہیں جو اس مضمون کو بیان کرتے ہوئے پیش کی جاتی ہیں کہ فلاں شخص نے توہین کی رسول کریم ﷺ نے اسے قتل کروا دیا۔اس لیے آج ہم بھی ایسا ہی کریں۔ان تمام واقعات کا الگ الگ تفصیلی اور تاریخی اعتبار سے جائزہ لینے کی بجائے عمومی رنگ میں بغیر اس تفصیل میں گئے تبصرہ کیا جا رہا ہے۔رسول کریم ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں ایک نبی و رسول اور دوسری بطور حاکم وقت۔حاکم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ نظام کو بہتر اور پر امن طریق پر چلانے کے لیے اقدامات کرے۔جس وقت مدینہ میں مسلم ریاست کا قیام عمل میں آیا اور دن بدن اس کا اثر رسوخ بڑھنے لگا تو یہ بات مشرکین اور یہود کو اپنے لیے بڑے خطرے طور پر نظر آئی۔انہوں نے اس کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنی شروع کی۔اسلام اور بانی اسلام کے خلاف باتوں، تقاریر اور اشعار کے ذریعہ زہر اگلنا شروع کر دیا۔یہ بات ایک قائم شدہ نظام کو تباہ کرنے کے مترادف تھی۔لوگوں کے اندر اسلام اور بانی اسلام کے خلاف اشتعال پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔جس کی وجہ سے خونریز جنگوں کا سلسلہ شروع ہو سکتا تھا۔اس سلسلے کو روکنے کے لیے ضروری تھا کہ اس تمام فتنہ کے بانیوں کا قلع قمع کیا جائے تا کہ عام لوگ ان کی باتوں میں آ کر تلوار نہ اٹھا لیں۔جس کی وجہ سے بہت زیادہ خون بہنا یقینی تھا۔آنحضرت ﷺ نے ان بڑی خونریزیوں کو روکنے کے لیے بعض اقدامات اٹھائے تا کہ آنے والے بڑے فتنوں کا استحصال ہو سکے۔اس زمانے میں ایسی کوئی جیلیں اور عدالتیں نہیں تھی جن میں باغیوں اور فتنہ پردازوں کو رکھا جاتا اور عین ممکن ہے اگر ان کو گرفتار کیا جاتا تو ان کے خاندان اور قبیلے والے خاندانی عصبیت کی بنا پر اسلام کے خلاف تلوار اٹھا لیتے۔اس بنا پر بانی اسلام نے قابل سزا مجرموں کو سزا دلوانے کا اس رنگ میں انتظام فرمایا کہ کم سے کم خون بہے اور فتنہ بھی فرو ہو جائے۔رسول کریم ﷺ نے یہ اقدامات پوری تحقیق اور تسلی کے بعد کے گئے تھے یہ نہیں کہ سنی سنائی بات اور بغیر ثبوت کے کوئی قدم اٹھایا۔جس طرح کوئی جج یا قاضی کسی کو سزا دینے کے لیے قانونی تقاضے پورے کرتا ہے اسی طرح اس زمانے میں رائج طریقہ کار کے مطابق پوری طرح تسلی ہونے کے بعد ان باغیوں اور فتنہ پردازوں کے بارے میں کوئی کاروائی کی گئی۔اگر یہ کہا جائے کہ صرف اور صرف توہین کی وجہ سے ان کو قتل کروایا گیا تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پورے نبوی دور اور پورے عرب میں صرف اور صرف وہ گنتی کے چند لوگ جنہوں نے رسول کریم ﷺ کے شان میں گستاخی کی تھی۔باقی تمام لوگ سچے اور پکے مؤمن تھے۔حالانکہ یہ بات حقائق و واقعات کے خلاف ہے۔

شریعت اسلامیہ کی طرف سے کوئی بات منسوب کرتے ہوئے پوری طرح چھان بین کر لینی چاہیے۔پھر کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہو تو پوری احتیاط کرنی چاہیے۔اسلام لوگوں کی زندگی لینے نہیں زندگی عطا کرنے آیا ہے۔اگر کسی کی زندگی لینے کی تعلیم جیسا کہ علماء کہتے ہیں قرآن میں موجود ہے تو اسے واضح ہونا چاہیے۔یہ کوئی معمولی بات تو نہیں کہ کسی کی زندگی کو ختم کر دیا جائے۔

آخر پر پھر اسی بات کو دوبارہ دہرایا جا رہا ہے کہ ہماری زندگی کا مشن یہ ہو کہ ہم حب رسول ﷺ کو دنیا میں پھیلائیں نہ خوف رسول ﷺ کو۔

❁❁❁

منور احمد کنڈے کی منظومات پر مشتمل تصنیف ''حرفِ منور'' کا پیش لفظ

تحریر: ڈاکٹر نذیر فتح پوری، پونہ

میں نے برطانیہ کے ادبی فلک کے درخشاں ستارے ڈاکٹر منوّر احمد کنڈے کو پہلی بار ان کی غزلوں کے تناظر میں دیکھا۔ وہ مجھے غزل کے ایک ذمہ دار شاعر محسوس ہوئے۔ ان کے مجموعۂ چہارم ''طاقِ دل'' میں ان کی غزل کی جو دنیا آباد ہے، اس کا کھلی آنکھوں سے میں نے مشاہدہ کیا ہے جس کے ہر ایک بام و در میں خوبصورت اشعار کے ہیرے جواہرات جگ مگ کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اب ''حرفِ منور'' کی نظمیں میرے مطالعہ میں آئیں تو ان کا پھیلاؤ اور فکری وسعت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ فی زمانہ تخلیقی ہنرمندیاں چار چھ اشعار کی غزل اور آٹھ دس سطور کی نثری نظموں تک سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ وہاں ردیف وقافیہ اور بحر ووزن سے مزین یہ نظمیں جناب منور احمد کنڈے کی وسیع ذہانت اور کشادہ دلی کا بین ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔

یہ بے مقصد اور محض تصورات کی ڈور سے باندھ کر تخیلات کے آسمان کی سیر کرانے والی نظمیں نہیں ہیں، بلکہ یہ نظمیں اپنے عہد اور زمانے کی تاریخ کا ایک ایسا البم ہے جس میں حالات وحقائق کی تصویریں الفاظ کی دروبست کے ساتھ مصوّر کر دی گئی ہیں۔ ڈاکٹر منور احمد کنڈے کا یہ کمال ہے کہ وہ کمال کی حد تک لفظوں سے تصویر بنانا جانتے ہیں۔ ان تصویروں میں کیسے کیسے عکس سمو دیے گئے۔ یہ حیرت کی بات ہے۔ منور احمد کنڈے غالب اور نظیر اکبر آبادی کی طرح حقیقت پسند شاعر ہیں۔ وہ رشتوں ناطوں پر یقین رکھتے ہیں۔ جنگ اور دہشت گردی سے انھیں شدید نفرت ہے۔ وہ حمدِ باری تعالیٰ اور حضرت محمد ﷺ کی نعت کے ساتھ ہی حضرتِ رومیؒ کی حکایات سناتے ہیں، اور رام، کرشن اور گورونانک جی کی مدح سرائی بھی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک انسانیت نواز شاعر کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ دنیا میں سکون وشانتی کے طلبگار ہیں۔ عراق، افغانستان اور فلسطین کی تباہی پر ان کا دل روتا ہے۔ ممبئی پر ہونے والے دہشت گردانہ حملوں کی وہ شدید مذمت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ حقائق کے اظہار سے خوف نہیں کھاتے۔ خودکش حملہ آوروں کو وہ رحمٰن کا نہیں شیطان کا سایہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اسلام ہو یا کوئی اور مذہب وہ انسانوں کے ذہنوں اور دلوں پر استبداد سے مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ طالبان نے خواتین پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں اپنی نظموں کے ذریعہ منور احمد کنڈے نے ان پر شدید احتجاج کیا ہے۔ انھیں افسوس ہے کہ وادیِ سوات طالبان کی زد میں ہے۔ وہ پاکستان پر امریکی ڈرون حملوں کی بھی مذمت کرتے ہیں۔

جب وہ پورے طور پر ایک فطرت پسند شاعر بن جاتے ہیں۔ تو دن، رات، قلم، کتاب، دل، دوستی، مٹی، پھول، درخت، پانی، اخلاق، محبت جیسی نظموں کی تخلیق کرتے ہیں۔ جب وہ قلم کاغذ لے کر اپنے خاندانی تخت پر براجمان ہو جاتے ہیں۔ تو میاں بیوی کی ہم رشتگی، شریکِ حیات، ماں، مدرز ڈے، فادرز ڈے، بیٹیاں، بابل، بیٹی کی رخصتی، سہرا، سمدھی جیسی خالص گھریلو رشتوں کی خوشبو میں بسی نظمیں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں۔

منور احمد کنڈے کی نظموں کا فطری بہاؤ دیکھ کر اور ان کی نظموں کی جزیات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اگر شاعر نہ ہوتے تو ایک اچھے افسانہ نگار ہوتے۔ چونکہ افسانے میں بیانیہ ریڈھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ منورؔ احمد نے اپنی نظموں میں بیانیہ پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ہر نظم ایک افسانہ، ایک کہانی، ایک حکایت معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے استعاروں اور تمثیلوں سے کام نہ لے کر سارا ماجرا صاف صاف بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظمیں مطالعہ کے دوران دل پر اثر انداز ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ان کی نظموں میں عقیدت اور عقیدے کا نور جھلملاتا محسوس ہوتا ہے۔ وہ بھٹکے ہوئے اذہان کی رہنمائی کے لیے حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ترقی کے نام پر بے راہ روی کو وہ قوم کے لیے مہلک تصور کرتے ہیں۔

ان نظموں کا تجزیاتی مطالعہ ایک طویل مضمون کا متقاضی ہے۔ راقم نے اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنی دو صفحات کی رائے پیش کی ہے۔ یہ ان نظموں کے ساتھ انصاف تو نہیں ہے۔ ویسے بھی کسی تخلیق کار کے ساتھ کوئی مبصر پورا پورا انصاف کر بھی نہیں سکتا۔ کسی بھی تخلیق کے لیے سب سے اہم انصاف کی بات یہی ہے کہ جس مقصد کے لیے تخلیق کار نے اسے زندگی عطا کی ہے۔ وہ اس مقصد کی حصول میں معاون ثابت ہو۔ امید ہے منور احمد کنڈے کی نظموں کو ان کے قارئین کی جانب سے پورا پورا انصاف ملے گا۔

الطاف حسین حالی کی نظم نگاری اور ڈاکٹر منور احمد کنڈے

کوئی نہ کوئی کامیاب قلمکار اپنے کسی نہ کسی پیش رو سے ضرور متاثر نظر آتا ہے۔ اس کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں۔ کوئی فکری طور پر کسی اہم شاعر سے متاثر ہو جاتا ہے، کوئی فنی طور پر کسی کو اپنا استاد مان لیتا ہے، کوئی اخلاقی طور پر کسی بڑے شاعر سے متاثر ہو کر اسی کے نقش قدم پر رواں دواں ہو جاتا ہے۔ نظم نگاری کے میدان میں منور احمد مولانا حالی سے متاثر ہی نظر نہیں آتے بلکہ انہوں نے جسارت کے ساتھ اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ راقم کے نام ایک خط میں منور احمد نے لکھا تھا۔

''میری بہت بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں آزاد نظم نہیں پڑھتا، کیونکہ اس ضمن میں مجھے یوں لگتا ہے جیسے نثر کو ظلم کی چکّی میں پیس کر منظوم نہیں بلکہ مظلوم کر دیا ہے جس کا نام ہم نے آزاد نظم رکھ دیا ہے۔ یہ میرا اپنا احساس ہے۔''

منور احمد نہ آزاد نظمیں کہتے ہیں نہ آزاد نظم پڑھتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے اس حقیقت کے پیچھے کیا راز ہے۔ راقم کے ایک سوال کے جواب میں منور احمد نے لکھا تھا کہ۔

''شاعری کے میدان میں میرا کوئی استاد نہیں لیکن خواجہ الطاف حسین حالی میرے کتابی استاد ہمیشہ رہے ہیں''۔

آخر منور احمد نے حالی کو ہی استاد بنایا غالب کو کیوں نہیں۔ اس کی وجہ ہے کہ حالی ایک اصول پسند شاعر تھے وہ شاعری میں نظم وضبط کے پابند تھے انھوں نے غزل کے بعد نظم کو اپنی تخلیق کا ذریعہ بنایا پھر باقاعدہ نظم نگاری کی تحریک چلائی۔ آزادؔ، سرورؔ نے حالی کا ساتھ دیا۔ بقول رام بابو سکسینہؔ۔

''ان تینوں نے نئے مضامین اور نیا طرز انشا زبان میں داخل کیا۔ تینوں نے مل کر قومی نظمیں لکھیں۔ خیالی نظموں کا جادو جگایا اور بیانیہ نظمیں بھی کثرت سے لکھیں۔ ان کی منصوبہ بند کوششوں سے پرانی قیود اور جکڑ بندیاں ٹوٹیں۔ نظم کا دائرہ وسیع ہوا۔ میدانِ شاعری کو وسعت دی گئی۔ سادگی، بے تکلفی اثر اور جذبات اس رنگ کی نظموں کے خاص جوہر ہیں۔''

(تاریخ اردو ادب۔ صفحہ نمبر ۲۴)

یہ تھے وہ تخلیقی جوہر جن سے متاثر ہو کر منور احمد نے آزاد، سرور اور حالی کے مثلث سے حالی کا نام منتخب کیا اور ان کو اپنا کتابی استاد مان لیا۔

یہ کتابی استاد کیا ہوتا ہے۔ معنوی استاد کسے کہتے ہیں۔ کچھ لوگ احترام کے طور پر بھی کسی پیش رو کو اپنا استاد مان لیتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے سعادت مندی کی بات ہے۔ منور احمد حالی کو کتابی استاد مان کر ان کے تتبع میں پابند نظمیں لکھنے لگے۔ تمام نظمیں، باعنوان، بامقصد، منظم، مسلسل اور مربوط۔

یہ زمانہ ایک طرح سے ادبی بے راہ روی کا زمانہ ان معنوں میں ہے کہ ادب میں بے تحاشہ تجربات کے دروازے کھُل چکے ہیں۔ دو سطروں اور تین سطروں میں نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ اسی طرح بہت سے اہلِ قلم سہل پسندی کا شکار ہو چکے ہیں، لیکن حالی کے نقش قدم پر چل کر منور احمد نے تخلیقی ادب کی ساری اخلاقی پابندیاں خود پر لگا رکھی ہیں۔ حالی نے پابند نظموں کی کشت کو سرسبز وشاداب رکھنے کے لیے اپنا خون بہایا اسی کی عملی جھلک ہمیں منور احمد کی نظموں میں نظر آتی ہے۔ (منورؔ احمد کنڈے کی ۵۰۰ اشعار کی ایک مثنوی ''دُرِّ منور'' کے زیرِ عنوان

بھی تخلیق کے مراحل میں ہے!)

حالیؔ کے یہاں اسلامی تصور کی حامل نظمیں ملتی ہیں حالانکہ منور احمد نے تا حال مسدس حالی جیسی کوئی نظم نہیں لکھی لیکن ان کی بہت سی نظمیں اپنے آپ میں اسلامی تصور کی حامل قرار دی جا سکتی ہیں۔ حالیؔ نے نیچر کی پیروی کی۔ منور احمد نے بھی حالی کے نقش قدم سے ذرا فاصلے پر اپنے نقش قدم ثبت کرنے کی شعوری کوشش کی اور کتابی شاگرد ہونے کا حق ادا کیا۔ حالی نے مبالغہ سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا۔ اپنے دور اور زمانے کے حساب سے منور احمد کنڈے نے بھی مبالغہ آمیز گفتگو سے پرہیز کیا۔

حالی کی طرح ان کی عبارت بھی صاف اور سادہ ہے۔ جہاں جو لفظ استعمال کیا ہے وہاں اس کا تخلیقی حق ادا کیا ہے۔ بے اعتدالی اور بے راہ روی جس طرح ہمیں حالیؔ کے یہاں نظر نہیں آتی منور احمد بھی ان عیوب سے خاصے دور نظر آتے ہیں، بقول رام بابو سکسینہ:

”نیچرل شاعری میں بھی ان کا کلام لاجواب ہے اور ان کا (حالی کا) یہ احسان کبھی نہ بھولے گا کہ انھوں نے اردو شاعری کو بڑی حد تک ان مضر اخلاق چیزوں سے پاک وصاف کر دیا جو اس میں سرائیت کیے ہوئے تھیں۔ (تاریخ اردو ادب۔صفحہ نمبر ۲۵۴)

ایسی ہی خوبیوں کا پرتو ہمیں ڈاکٹر منور احمد کنڈے کی نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔ منور احمد کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ انھوں نے مثبت اور منفی دونوں موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ وہ جہاں اجالوں کا نغمہ الاپتے ہیں وہاں اندھیروں کا ماتم بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر گہری ہے۔ ان کے مشاہدے کی بھی نظر تیز ہے۔ وہ منظر کے ساتھ پس منظر کے عکس بھی قید کر لیتے ہیں۔ اس طرح کہ وہ کہیں ذہنی طور پر تھکن بھی محسوس نہیں کرتے۔

آئندہ صفحات ہم منور احمد کی نظموں پر سیر حاصل گفتگو بھی کریں گے۔ تب تک کے لیے اجازت لینے سے قبل میں ایک حقیقت قارئین کے گوشِ گزار کرنا چاہتا ہوں کہ منورؔ احمد کنڈے نے حالیہ برسوں میں بیسیوں توشیحات لکھ کر اپنے ہمعصر شعراء اور ادباء کے دل جیت لئے ہیں جو ہر سخنور کے بس کی بات نہیں۔

❁❁❁

غزل

کہاں کسی کی حمایت میں مارا جاؤں گا
میں کم شناس مروت میں مارا جاؤں گا

میں مارا جاؤں گا پہلے کسی فسانے میں
پھر اس کے بعد حقیقت میں مارا جاؤں گا

مجھے بتایا ہوا ہے مری چھٹی حِس نے
میں اپنے عہدِ خلافت میں مارا جاؤں گا

مرا یہ خون مرے دشمنوں کے سر ہو گا
میں دوستوں کی حراست میں مارا جاؤں گا

یہاں کمان اٹھانا مری ضرورت ہے
وگرنہ میں بھی شرافت میں مارا جاؤں گا

میں چپ رہا تو مجھے مار دے گا میرا ضمیر
گواہی دی تو عدالت میں مارا جاؤں گا

فراغ میرے لیے موت کی علامت ہے
میں اپنی پہلی فراغت میں مارا جاؤں گا

نہیں مروں گا کسی جنگ میں یہ سوچ لیا
میں اب کی بار محبت میں مارا جاؤں گا

❁❁❁

رانا سعید روشی ....

شعبہ گوشۂ ادب

مرزا چپاتی - اردو کے مشہور خاکے

تحریر: اشرف صبوحی

خُدا بخشے مرزا چپاتی کو، نام لیتے ہی صورت آنکھوں کے سامنے آگئی۔ گورا رنگ، بڑی ہوئی ابلی ہوئی آنکھیں، لمبا قد شانوں پر سے ذرا جھکا ہوا۔ چوڑا شفاف ماتھا۔ تیموری ڈاڑھی، چنگیزی ناک، مغلئی ہاڑ۔ لڑکپن تو قلعے کی درودیوار نے دیکھا ہوگا۔ جوانی دیکھنے والے بھی ٹھنڈا سانس لینے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ڈھلتا وقت اور بڑھاپا ہمارے سامنے گزرا ہے۔ لٹے ہوئے عیش کی ایک تصویر تھے۔ رنگ روغن اترا ہوا محمد شاہی کھلونا تھا جس کی کوئی قیمت نہ رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ دلّی کے آخری تاج دار ظفر کے بھانجے تھے۔ ضرور ہوں گے۔ پوتڑوں کی شاہ زادگی ٹھیکروں میں دم توڑ رہی تھی، لیکن مزاج میں رنگیلا پن وہی تھا۔ جلی ہوئی رسّی کے سارے بل گن لو۔ جب تک جیے پرانی وضع کو لیے ہوئے جیے۔ مرتے مرتے نہ کبوتر بازی چھوٹی، نہ پتنگ بازی۔ مرغے لڑائیں یا بلبل، تیراکی کا شغل رہا یا شعبدے بازی کا۔ شطرنج کے بڑے ماہر تھے۔ غائب کھیلتے تھے خدا جانے غدر میں یہ کیوں کر بچ گئے اور جیل کے سامنے والے خونی دروازے نے ان کے سر کی بھینٹ کیوں نہ قبول کی؟ انگریزی عمل داری ہوئی۔ بدامنی کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو مراحمِ خسروانہ کی لہر اٹھی۔ خاندانِ شاہی کی پرورش کا خیال آیا، پینشنیں مقرر ہوئیں۔ مگر برائے نام۔ ساڑھے تیرہ روپے مرزا چپاتی کے حصے میں آئے۔ اللہ اللہ کیا زمانے کا انقلاب ہے۔ ایک ذرا سے چکر میں تقدیر ہزار قدم پیچھے ہٹ گئی۔

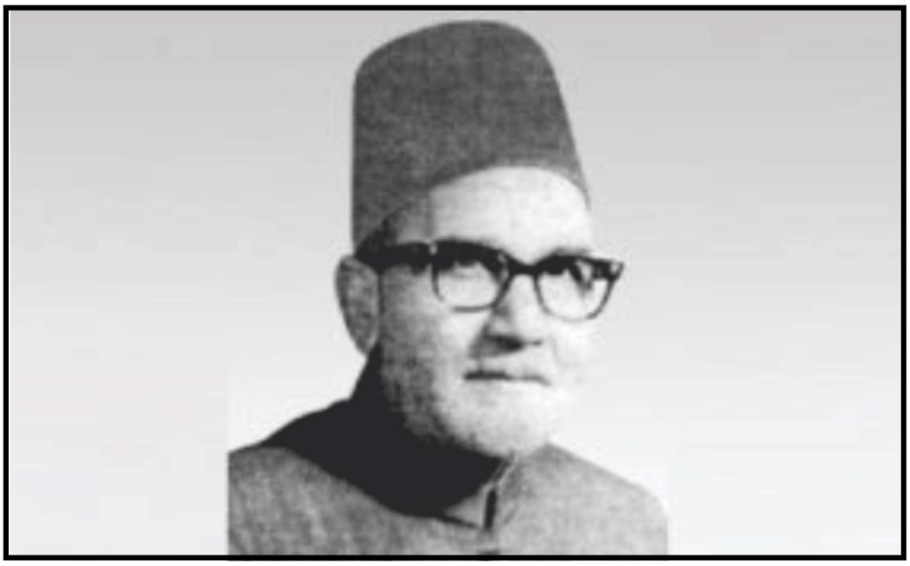

لیکن صاحب عالم مرزا فخر الدین عرف مرزا فخرو الملقب بہ مرزا چپاتی نے مردانہ وار زندگی گزاری۔ گھر بار جب کبھی ہوگا، ہوگا۔ ہماری جب سے یاد اللہ ہوئی دم نقد ہی دیکھا۔ قلعے کی گود میں بازیوں کے سوا اور سیکھا ہی کیا تھا جو بگڑے وقت میں اُبرد بتاتا۔ اپنے والد رحیم الدین حیا سے ایک فقط شاعری ورثے میں ملی تھی۔ پڑھنا لکھنا آتا نہ تھا۔ پھر زبان توتلی۔ مگر حافظہ اس بلا کا تھا کہ سوسو بند کے مسدّس ازبر تھے۔ کیا مجال کہ کہیں سے کوئی مصرع بھول جائیں۔ گویا گراموفون تھے کوک دیا اور چلے۔

حاضر دماغ ایسے کہ ایک مرتبہ دہلی کی مشہور ڈیرہ دار طوائف دونّی جان جو ادھیڑ عمر کی عورت ہو چکی تھیں کہیں سامنے سے آتی نظر آئیں۔ انھیں دیکھ کر مرزا کے کسی دوست نے کہا کہ استاد اس وقت دونّی جان پر کوئی پھبتی ہو جائے تو مزہ آجائے۔ بھلا مرزا صاحب کہاں چوکنے والے تھے۔ فوراً بولے

گھستے گھستے ہوگئی اتنی ملٹ
چار پیسے کی دونّی رہ گئی

اس طرح ایک دن کسی شخص نے مرزا صاحب کے سامنے یہ مصرع پڑھا، سرعدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب۔ اور اس پر مصرع لگانے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب نے اسی وقت بہترین مصرع لگا کر اس طرح ایک اعلیٰ پایہ کا شعر بنا دیا:

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے
سرعدو کا ہو نہیں سکتا میرے سر کا جواب

قلعہ مرحوم کے حالات اور موجودہ تہذیب پر ان کی نوک جھونک جتنی مزہ دیتی تھی، وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے پتنگ بازی کے دنگلوں میں لے جاتے تھے۔ مرغ اور بلبلوں کی پالیاں بھی دکھائیں۔ تیراکی کے میلوں میں بھی

لے گئے۔ کبوتر بھی مجھے دکھا دکھا کر اڑائے۔ سب کچھ کیا، میں جہاں تھا وہیں رہا۔ ہر جگہ ان کا دماغ کھایا۔ انھیں بھی میری خاطر ایسی منظور تھی کہ با دلِ خواستہ یا ناخواستہ وہ سب کچھ مجھے بتاتے۔

ایک دن دوپہر کے کوئی دو بجے ہوں گے۔ برسات کا موسم تھا۔ کئی گھنٹے کی موسلا دھار بارش کے بعد ذرا بادل چھٹے تھے کہ حضرت معمول کے خلاف میرے پاس تشریف لائے۔ منہ بنا ہوا۔ آنکھیں ابلی ہوئی۔ چہرے سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا خدا خیر کرے آج تو صاحب عالم کے تیور کچھ اور ہیں۔ کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے اور میں ان کا منہ تکتا رہا۔ ذرا سانس درست ہوا تو بولے "سید! اس پٹھانچے کاٹر (یعنی اُلٹے دماغ کا) مغزا پن بھی دیکھا۔ بڑا افلاطون بنا پھرتا ہے۔ باوا تو جھک جھک کر مجرا کرتے کرتے مر گیا، یہ بابو بن کر یا بو کی طرح دُلتیاں جھاڑتا ہے۔ ہے شرط کہ چار جامہ کس دوں، ساری ٹرفش نکل جائے گی۔"

میں: میں بالکل نہیں سمجھا۔ ہوا کیا؟ کون پٹھانچہ؟

مرزا: ایسے ننھے سمجھے ہی نہیں۔ میاں وہی کالے خاں کا لڑکا جو کچہری میں نوکر ہے۔ میں: منیر۔ کیا اس نے کچھ گستاخی کی؟

مرزا: گستاخی! نہ ہوا ہمارا زمانہ خاندان بھر کو کولہو میں پسوا دیتا۔

میں: بڑا نالائق ہے کیا بات ہوئی؟

مرزا: ہوا یہ کہ میں کبوتروں کا دانہ لینے نکلا۔ گلی کے نکڑ پر بنیے کی دکان ہے۔ نالیوں میں دھائیں دھائیں پانی بہہ رہا تھا۔ ساری گلی میں کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ محلے والوں نے جابجا پتھر رکھ دیے تھے کہ آنے جانے والے اِن پر پاؤں رکھ کر گزر جائیں۔ دیکھتا کیا ہوں وہ اکڑے خاں بیچ گلی میں کھڑے ہوئے ایک خوانچے والے سے جھک جھک کر رہے ہیں۔ گلی تنگ، کیچڑ اور پانی۔ پتھروں پر ان کا قبضہ۔ کوئی بھلا اس پر گزرے تو کہاں سے؟

میں نے کہا کہ میاں راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ یہ کون سی انسانیت ہے کہ سارا راستہ روک رکھا ہے۔ تڑا کر جواب دیا کہ چلے جاؤ۔ مجھے تاؤ آ گیا۔ بولا کہ تمھارے سر پر سے جاؤں۔ بس پھر کیا تھا جامے سے باہر نکل پڑا۔ وہ تو پاس پڑوس کے دو چار آدمی نکل آئے اور بیچ بچاؤ کروا دیا ورنہ آج یا وہ نہیں تھا یا میں۔ خیر جاتا کہاں ہے۔ آج کے تھپے آج ہی نہیں جلا کرتے۔

میں: صاحب عالم۔ آپ اپنی طرف دیکھیے۔ جو ظرف میں ہوتا ہے وہی چھلکتا ہے۔ آنے دیجیے وہ ڈانٹ بتاؤں کہ ہاتھ جوڑتے بنے۔ سنا ہے کہ قلعے کے آخری دور ہی میں شہر کی حالت بدل گئی تھی۔ نہ چھوٹوں کا رکھ رکھاؤ رہا تھا نہ بڑوں کا ادب۔

مرزا: توبہ توبہ تم نے تو دلّی کو دم توڑتے بھی نہیں دیکھا۔ اس کا مردہ دیکھا ہے۔ مردہ۔ وہ بھی لاوارث! میاں شہر آبادی کی باتیں قلعے والوں کے صدقے میں تھیں۔ جیسے جیسے وہ اٹھتے گئے دلّی میں اصلیت کا اندھیرا ہوتا گیا۔ اب تو نئی روشنی ہے نئی باتیں۔ اور تو خدا بخشے دلّی کی صفتیں تم کیا جانو۔ پڑھے لکھے ہو۔ شاعری کا بھی شوق ہے۔ بھلا بتاؤ تو سہی اردو کی کتنی قسمیں ہیں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا "صاحب عالم اردو کی قسمیں کیسی؟

یہ بھی ایک کہی۔ مجھ پر بھی داؤں کرنے لگے۔" "واہ بھئی معلوم ہوا کہ تم دلّی والے نہیں۔ کہیں باہر سے آ کر بس گئے ہو۔" میں شرمندہ تھا کہ کیا جواب دوں۔ میرے نزدیک تو صرف ایک ہی قسم کی اردو تھی۔ زیادہ سے زیادہ عوام و خواص کا فرق سمجھ لو۔ مگر یہ قسمیں کیا معنی؟ مجھے چپ دیکھ کر مرزا مسکرائے اور کہنے لگے" سید پریشان نہ ہو۔ مجھ سے سن اور یاد رکھ۔ بھولیو نہیں پھر پوچھے گا تو نہیں بتاؤں گا۔"

میں بڑے شوق سے متوجہ ہوا اور انھوں نے انگرکھے کے دامن سے منہ پونچھ کر کہنا شروع کیا۔

دیکھ اوّل نمبر پر تو اردوئے معلّی ہے جس کو ماموں حضرت اور ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے بولتے تھے۔ وہاں سے شہر میں آئی اور قدیم شرفا کے گھروں میں آ چھپی۔ دوسرا نمبر قل آعوذی اردو کا ہے جو مولویوں، واعظوں اور عالموں کا گلا گھونٹتی رہتی ہے۔ تیسرے خود رنگی اردو۔ یہ ماں ٹینی باپ کلنگ والوں نے رنگ برنگ کے بچے نکالے ہیں۔ اخبار اور رسالوں میں اِسی قسم کی اردو، ادب کا اچھوتا نمونہ کہلاتا ہے۔ چوتھے ہڑونگی اردو، مسخروں اور آج کل کے قومی بلّم ٹیروں کی منہ پھٹ زبان ہے۔

پانچویں لفنگی اردو ہے جسے آ کا بھائیوں کی لٹھ مار، کڑاکے دار بولی کہو یا پہلوانوں، کرخن داروں، ضلع جگت کے ماہروں، پھبتی بازوں اور گلیروں کا روز مرّہ۔ چھٹے نمبر پر فرنگی اردو ہے جو تازہ ولایت انگریز، ہندوستانیوں عیسائی ٹوپ لگائے ہوئے کرانی، دفتر کے بابو، چھاؤنیوں کے سوداگر وغیرہ بولتے ہیں۔ پھر ایک سربھنگی اردو ہے یعنی چرسیوں، بھنگڑوں بینواؤں اور تکیے داروں کی زبان۔ "میں نے کہا آج تو بہرہ کھلا ہوا ہے۔

بھئی خوب تقسیم ہے۔ کیوں نہ ہو آخر شاہ جہانی دیگ کی کھرچن ہے۔ میری طرف دیکھ کر ایک گہرا ٹھنڈا سانس بھرا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے" سید! ابھی تم نے کیا دیکھا ہے اور کیا سنا ہے۔ قلعہ آباد ہوتا، دربار دیکھے ہوتے تو

اصلی زبان کا بناؤ سنگھار نظر آتا۔ اب تو ہماری زبان بیسنی ہوگئی ہے۔ وہ پچھلی چونچلے کی باتیں، شریفوں کے انداز، امیروں کی آن، سپاہیوں کی اکڑفوں، وہ خادمانہ اور خوردانہ آداب وانکسار، شاعروں کے لچھے دار فقرے، شہر والوں کا میل جول، پرانے گھرانوں کے رسم ورواج، وہ مروّت وہ آنکھ کا لحاظ کہاں؟

مجلسوں محفلوں کا رنگ بدل گیا، میلے ٹھیلے، پرانے کرتب، اگلے ہنر سب مٹتے جاتے ہیں۔ اشراف گردی نے بھلے مانسوں کو گھر بٹھا دیا، فیل نشین، پالکیوں میں بیٹھنے والے کھپریلوں میں پڑے ہوئے ہیں، مفلسی، ناداری نے رذالوں کے آگے سر جھکوا دیے۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھ گئی۔ کم ظرفوں، ٹینیوں کے گھر میں دولت پھٹ پڑی۔ زمانہ جب کمینوں کی پشتی پر ہو تو خاندانیوں کی کون قدر کرتا؟ پیٹ کی مار نے صورتیں بگاڑ دیں، چال چلن میں فرق آ گیا۔ ہمت کے ساتھ حمیت بھی جاتی رہی۔

مرزا نے یہ تقریر کچھ ایسے عبرت خیز لفظوں میں کی کہ میرا دل بھر آیا اور میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کی کوشش کی۔

میں: کیوں حضّت، غدر سے پہلے دلّی والوں کا لباس کیا تھا؟ دو چار پرانی وضع کے لوگ دیکھنے میں آئے ہیں۔ ان کی برزخ تو کچھ عجیب ہی سی معلوم ہوتی تھی۔

مرزا: جھوٹے ہو تم نے کہاں دیکھا ہوگا۔ کوئی بہروپیا یا نقال نظر آ گیا ہوگا۔ میاں ان وقتوں میں ادنا اعلا میں یک رنگی نہ تھی۔ درباری اور بازاری لوگ لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ عام طور پر اپنی شکل وشباہت، تن ونوش، جسامت اور پیشے کے مطابق کپڑا پہنا جاتا تھا تاکہ دور سے دیکھ کر پہچان لیں کہ کس خاندان کا اور کیسا آدمی ہے؟ اگر نوجوان ہے تو ایک ایک ٹانکے پر جوانی برستی ہے۔ بوڑھا ہے تو پیری اور سادگی ٹپکتی ہے۔

بانکوں کا بانک پن، چھیلاؤں، ملّاؤں کی ملائی، پہلوانوں کی پہلوانی، رذالوں کی رذالت اور شریفوں کی شرافت لباس سے صاف بھانپ لی جاتی تھی۔ چھوٹے آدمی جس پوشاک کو اختیار کر لیتے تھے، بھلے مانس چھوڑ دیتے۔ دوپلڑی ٹوپیوں کا عام رواج تھا مگر چوگوشی، پنج گوشی، گول، مغلئی، تاج دار ٹوپیاں، مغل بچے اور شریف زادے پہنتے تھے۔ قلعے کے آنے جانے والوں میں مندیلیں، بنارسی دوپٹے، گولے دار پگڑیاں۔ مسلمانوں کا حصہ تھا۔

درباری جامہ بھی پہنا کرتے تھے۔ امرا جیغہ سرپیچ اور شہزادوں میں کلغیاں بھی مروّج تھیں۔ ہندوؤں میں پہلے جامے کا زیادہ دستور تھا، پھر نیم جامہ اور الٹی چولی کے انگرکھے پہننے لگے۔ علاوہ ازیں الخالق، اچکن، قبا، عبا، جُبّہ، چغہ، مرزئی وغیرہ بھی استعمال ہوتے تھے۔ پائجامے یا تو تنگ موری کے یا اِک برے یا غرارے دار ہوتے تھے۔ ڈاڑھی مونچوں کی وضع بھی ہر خاندان اور ہر پیشہ ور کی علاحدہ تھی۔ آج کی طرح نہیں کہ کوٹ پتلون نے تمیز ہی اڑا دی۔

دوسروں کی پوشاک پہننے میں کوئی شرماتا ہی نہیں۔ علی گڑھ والوں کو شیروانی اور دوتکیوں کے غلاف والا پائجامہ پہنتے دیکھا، اس کی نقل کر لی۔ پنجابی آئے تو ان کی شلواریں اڑا لیں۔ مونچھوں کی جگہ بچھو پال لیے۔ ڈاڑھی کبھی چونچ دار ہے تو کبھی صاف چٹ اور تھوڑے دن سے تو "ڈاڑھی کو منڈا ڈال تو مونچھوں کا بکھیڑا" سنتے آئے تھے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہندو مسلمان کی پہچان تو ایک طرف، مردوں پر عورتوں کا دھوکا ہونے لگا ہے۔ اور کہاں تک سُناؤں۔ بس یہ سمجھ لو کہ دلّی کا نقشہ ہی بدل گیا۔

میں: مگر یہاں والوں کو فضول کھیلوں، دولت کو لٹانے والی بازیوں اور بے کار مشغلوں کے سوا کام ہی نہ تھا۔

مرزا: تم کیا جانو کہ وہ بازیاں اور ان کے مشغلے کیسے کمال کے تھے۔ ویسے ہنر آج کوئی نہیں پیدا کر لیتا۔ زہرہ پھٹ جائے زہرہ۔ بات یہ ہے کہ ساری چیزیں وقت سے ہوتی ہیں۔ نامردوں کا زمانہ ہے تو نامردوں کی سی باتیں بھی ہیں۔ شریفوں کا شغل ڈنٹر، مگدر، بالک، بنّوٹ، پھکیتی۔ اکنگ، تیراندازی نیزہ بازی، پنجہ کشی تھا۔ کہہ دو بے کار تھا۔ تیراکی، کشتی، شکرے اور باز کا شکار، پتنگ لڑانا، کبوتر بازی وغیرہ سے دل چسپی تھی۔ کہہ دو یہ بھی فضولیات ہیں۔

میں: فضولیات نہیں تو اور کیا ہیں۔

مرزا: جی ہاں فضولیات ہیں۔ خدا کے بندے ان ہی باتوں سے تو دلّی دلّی تھی۔ ورنہ شاہجہاں کی بسائی ہوئی محمد شاہی دلّی اور خورجہ بلند شہر میں کیا فرق۔ پھکیت اور بنویٹے ایسے ہوتے تھے کہ موقع پڑتا تو رومال میں صرف پیسا یا ٹھیکری باندھ کر حریف کے سامنے آ جاتے اور دو جھکائیوں میں ہتھیار چھین لیتے۔ تیراکی کا یہ حال تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے ہیں جیسے مسند پر۔ ایک زانو پر پیچوان لگا ہوا ہے، دوسرے پر رنڈی بیٹھی ہے۔

دھواں اڑاتے اور ملہار سنتے چلے جاتے ہیں۔ قلعے کی حمام والی نہر تو دیکھی ہوگی۔ گز سوا گز کا پلاٹ ہے اور بالشت بھر سے زیادہ گہرائی نہیں۔ اس میں آج کوئی مائی کا لال تیر کر دکھائے تو میں جانوں۔ میر مچھلی تو خیر استاد تھے، ان کا سا کمال تو کسے میسر ہے۔ دو چار گز تو اتنے پانی میں تیر کر میں بھی دکھا سکتا ہوں۔

میں: اجی جناب آپ ریت پر تیریے۔ حبابوں پر کھڑی لگائیے نتیجہ؟ کھیل ہی

تو تھے۔ پھر یہ کبوتر بازی، پتنگ بازی، مرغ بازی، مینڈھے بازی کیا بلا تھی؟ بچارے بے زبانوں کو لہولہان کرنا اور اپنا دل بہلانا کیا اچھے ہنر تھے۔

مرزا: ارے میاں ایرانی تورانی منچلے دہم ہو کر کیا چوڑیاں پہن لیتے۔ جنگ وجدال کا خیال انسانی قربانیوں، ملک ستانیوں کے چاؤ۔ خون کی پچکاریوں سے ہولی کا وقت تو لد گیا تھا۔ نہ ان پر کوئی چڑھ کر آتا تھا نہ یہ کہیں چڑھائی کرتے تھے۔ انگریزی عمل داری کی برکت سے نکسیریں بھی نہیں پھوٹتی تھیں۔ وہ جانوروں کو ہی لڑا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔ میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ مرزا نے ایک جھرجھری لی اور یہ کہتے ہوئے کہ بھئی غضب ہو گیا شام ہونے آئی۔ کبوتر بھوکے میری جان کو رو رہے ہوں گے اور چوک کا وقت بھی آ لگا ہے۔ لال بند کا جوڑ الگانا ہے، یہ جا وہ جا۔

ان باتوں کو کوئی ایک مہینہ گزرا ہو گا کہ صبح ہی صبح مرزا صاحب چلے آتے ہیں۔ آتے ہی فرمانے لگے "پرانی عیدگاہ چلنا ہوگا۔" میں نے کہا "خیریت؟" بولے "لکھنؤوں سے پیچ ہیں۔ جانوں ڈھیری یا مالوں ڈھیری۔ پانچ روپے پیچ ٹھہرا ہے، بڑا معرکہ ہوگا۔" میں نے عرض کیا "صاحب عالم مجھے نہ تو پتنگ بازی سے کوئی دل چسپی ہے نہ میرے پاس اتنا فضول وقت ہے کہ آپ کے ساتھ واہی تباہی پھروں۔" تاؤ کھا کر آنکھیں نکال لیں اور حاکمانہ انداز سے کہنے لگے "تمھاری اور تمھارے وقت کی ایسی تیسی۔

بس کہہ دیا کہ چلنا ہوگا۔ دوپہر کو آؤں گا تیار رہنا۔" میں بہت پریشان ہوا مگر کرتا کیا، دوستی تھی یا مذاق۔ قہر درویش بجانِ درویش۔ اپنی ساری ضرورتوں کو طاق پر رکھا اور حضرت مرزا چپاتی کا منتظر تھا کہ ٹھیک بارہ بجے آواز پڑی "سید آؤ"۔ آگے آگے مرزا صاحب اور پیچھے پیچھے میں۔ اجمیری دروازے سے نکل قبرستان لانگتے پھلانگتے پرانی عیدگاہ پہنچے۔ وہاں دیکھا تو خاصا میلا لگا ہوا ہے۔ کبابی، کچالو والے، دہی بڑوں کی چاٹ، پان بیڑی، پانی پلانے والے سقّے پوری خرافات موجود ہے۔

جا بجا پتنگ بازوں کی ٹکڑیاں بیٹھی ہیں۔ مرزا صاحب کو دیکھتے ہیں "صاحب عالم ادھر"، "مرزا صاحب ادھر"، "استاد پہلے میری سن لیجیے"، میاں ادھر آنے دو۔ بات سمجھتے ہیں۔ نہ بات کی دُم اڑنے سے کام۔ حضّت آپ یہاں آئیے۔ میر کنکیّا آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ چاروں طرف سے آوازیں پڑنے لگیں۔ مرزا چو کنّے ایک ایک کو جواب دیتے شامیانے کے نیچے جہاں میر کنکیّا تشریف فرما تھے، پہنچے۔

میر کنکیّا لکھنؤ کے واجد علی شاہی پتنگ باز تھے۔ کاکریزی رنگ، گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی ناک، دانتوں میں کھڑکیاں، سر پر کڑ بڑے پٹھے۔ خشخاشی ڈاڑھی، چھاتی کھلا سنجاف دار ڈھیلا ڈھالا انگرکھا، سر پر دو انگلی کی کلابتو کے حاشیے کی ٹوپی، پاؤں میں مخملی گرگابی، کلے ّمیں گلوری، اٹھ کر مرزا چپاتی سے بغل گیر ہوئے۔ پھر جو پتنگ بازی کا ذکر شروع ہوا تو تین بج گئے۔ میں بے وقوفوں کی طرح بیٹھا ہوا ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔

پتنگ بازی کی ہوتی تو ان کی اصطلاحیں سمجھ میں آتیں۔ آخر خدا خدا کر کے لوگ اپنی اپنی ٹکڑیوں میں گئے۔ آسمان پر چیل کوّے منڈلانے شروع ہوئے۔ میں مرزا صاحب کے ساتھ تھا۔ عیدگاہ کی دیوار کے نیچے سے انھوں نے بھی اپنا اختر بختر کھول کر ایک انگارا اڈھا اڑایا۔ ہچکا ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی دس منٹ تک جھکائیاں دیتے رہے، پیچ ہوا۔ کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔ ایک دفعہ ہی جھلا کر لڑکے کو تمانچا رسید کیا اور بولے "ابے ہچکا پکڑنے کی سُرت بھی نہ تھی تو یہاں آن کیوں مرا، آخر کٹوا دیا نا۔"

پھر ایک الفن بڑھائی اور اب کے ہچکا پکڑنے کی خدمت مجھے انجام دینی پڑی۔ بدقسمتی سے یہ گڈّی بھی کٹ گئی۔ بہت بگڑے کہ بس جب تم جیسے منحوس ساتھ ہوں تو ہم اڑا چکے۔ غضب ہے سانولیا ہمیں استاد کہنے والا، میر گولنداز ہمارے ہاں کے شاگرد، شیخ پیچک جیسے برابر پیچ نکالے جاتے ہیں اور مرزا فخرو اوپر نیچے دو کنکوّے کٹوائے۔ سمیٹو میاں سمیٹو مجھے اپنی استادی تھوڑی گنوانی ہے۔ "وہ کہتے رہے، میں تو وہاں سے ہٹ کر رومال بچھا کر الگ جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر میں وہ بھی اپنا اسبابِ جہالت لنگی میں باندھے میرے پاس آ بیٹھے۔ تیوری پر بل تھے، چہرہ سرخ آنکھیں ابلی ہوئی۔ میں نے کہا مرزا صاحب ہوا کا کھیل ہے۔ اس میں کسی کی کیا پیری۔ آپ کی استادی میں کہیں فرق آتا ہے۔ سلطنت ہی جب ہتھے پر سے کٹ گئی تو ان دو کاغذ کے ٹکڑوں کا کیا غم؟ آپ، آپ ہی ہیں۔ کہنے لگے "سچ کہتے ہو۔ میاں ہم قلعے والوں کی تقدیر ہی خراب ہے۔ ہوا بھی موافقت نہیں کرتی۔ میں نے ان کے بشرے سے ان کی دِلی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے اس ذکر کو موقوف کر دیا اور پوچھا "کیوں مرزا صاحب قلعہ جب آباد تھا اس وقت بھی پتنگ بازی کے ایسے ہی دنگل ہوتے تھے؟" مرزا: اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ اس وقت کا سماں کیوں کر دکھاؤں۔ میاں ہر بات میں اک شان تھی، ایک قاعدہ تھا اور ہزاروں غریبوں کی روٹیوں کے سہارے۔ معمول تھا کہ عصر کا وقت ہوا اور سلیم گڑھ پر جمگھٹ لگا۔

بڑے بڑے پتنگ، دو تادی اور سہ تادی تکلّیں، ڈور کی چرخیاں لے کر شاہی پتنگ باز پہنچ گئے۔ خلوت کے امیر اور شوقی شہزادے مرزا ابّو، مرزا کدال، مرزا کالیٹن، مرزا چڑیا، مرزا جھر جھری بھی آموجود ہوئے۔ یہ سلاطین زادے بہت منہ چڑھے تھے۔

میں: (بات کاٹ کر) حضّت یہ نام کیسے؟ کیا اسی بولی کا نام اردوے معلّی ہے۔

مرزا: کچھ پڑھا لکھا بھی، یا گھاس ہی کھودتے رہے ہو۔ ارے زبان کی ٹکسالی قلعے ہی میں تو تھی، وہاں محاورات نہ ڈھلتے تو کہاں ڈھلتے۔ طبیعتیں ہر وقت حاضر رہتی تھیں۔ ہر بات میں جدّت مدِّ نظر تھی۔ ہنسی مذاق میں جو منہ سے نکل گیا گویا سکّہ ڈھل گیا۔ کسی کے پھٹے پھٹے دیدے ہوئے مرزا ابّو کہہ دیا۔ لمبا چہرہ، چگّی ڈاڑھی دیکھی، مرزا چکا یا مرزا کدال کہنے لگے۔ چکلے چہرے والے پر چوپال کی اور ٹھنگنے پر گھٹنے کی پھبتی اڑا دی۔ غرض کہ مرزا چیل، مرزا جھپٹ، مرزا یاہو، مرزا رنگیلے، مرزا رسیلے بیسوں اسم با مسمیٰ تھے۔ میں جمعرات کو چپاتیاں اور حلوا بانٹا کرتا تھا، میرا نام مرزا چپاتی مشہور کر دیا۔

میں: لیجیے ہمیں آج تک مرزا چپاتی کی وجہ تسمیہ ہی معلوم نہ تھی۔ یہ آپ کا خیر سے ٹکسالی نام ہے۔

مرزا: اب زیادہ نہ اِتراؤ۔ قصہ سُننے ہو یا کوئی پھبتی سُننے کو جی چاہتا ہے۔

میں: اچھا اب کان پکڑتا ہوں بیچ میں نہیں بولوں گا۔ فرمایئے۔

مرزا: سب سامان لیس ہو گیا تو بڑے حضرت کی سواری آئی۔ دُعا سلام مجرے کے بعد حکم لے کر دریا کی طرف پتنگ بڑھایا گیا۔ دوسری جانب سے معین الملک نظارت خاں بادشاہی ناظر کا، مرزا یا ور بخت بہادر یا جس کے لیے پہلے سے ارشاد ہو چکا ہے، پتنگ اٹھا۔ ریتی میں سوار کھڑے ہو گئے۔ پیچ لڑے، ڈھیلیں چلیں۔ پتنگ یا تُکلّیں چھپکتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ یا ہاتھ روک کر ڈور دی تو ڈوبتے آسمان سے جا لیں۔ پیٹا چھوڑ دیا، ڈوریں زمین تک لٹک آئیں، سواروں نے دوشاخے بانسوں پر لے لیں۔

پتنگ کٹا تو دریا کے وار پار ڈور پڑ گئی۔ ڈوریں لٹیں۔ پتنگ کے پیچھے پیچھے غول کے غول شاہدرہ تک نکل گئے۔ جس نے وہ نکل یا پتنگ لوٹی پانچ روپے کی مزدوری کی۔ ڈور بھی بیس بیس تیس تیس روپے سیر بک جاتی تھی۔ بادشاہ کبھی تو خالی سیر ہی دیکھتے رہتے۔ کبھی جی میں آتا تو تختِ رواں سے اتر پڑتے۔ مچھلی کے چھلکوں کے دستانے پہن لیے۔ پتنگ ہاتھ میں لیا ایک آدھ پیچ لڑایا اور ہنستے بولتے محل معلّی میں داخل ہو گئے۔ سید! یہ بھی خبر ہے کہ وہ پتنگ یا تکلّیں کتنی بڑی اور کیسی محنت سے بنائی ہوئی ہوتی تھیں؟ تکلّیں تو تمھارے پیدا ہونے سے پہلے مر چکیں۔ خیر میں کبھی ان کی تصویر دکھاؤں گا۔ تو وہ قد آدم ہوتی تھی اور ایک ایک کی تیاری میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ ڈوریں بھی اِک بلی، دو بلی، تبلی، چوبلی کنکوّوں اور تکلّوں کے زور کے موافق بنتی تھیں۔ مانجھوں کے نسخے بھی ہر گھرانے کے الگ تھے۔ تکلّیں تو تکلّیں آج ویسے پتنگ بھی نہ بنتے ہیں نہ کسی میں اتنا بوتا ہوتا ہے کہ ان کی جھونک سنبھال سکے۔ چھوٹی تختیں رہ گئی ہیں یا بڑے نامی پتنگ بازوں کے ہاں اڈّھے۔ وہ بھی کنکوّے نہیں گڈّیاں ہوتی ہیں۔ لنڈوری بن پنچھلّے کی۔

میں: بھئی واقعی لُطف تو بڑا آتا ہو گا۔

مرزا: جہاں اپنی حکومت، گھر کی بادشاہت اور پرائی دولت ہوتی ہے، یہی رنگ ہوا کرتے ہیں۔ عشرت گاہوں میں ہر وقت نمازیں نہیں پڑی جاتیں۔ مجاہدے اور مراقبے نہیں ہوتے۔ یہ نہ اٹھائیں تو زندگی کی راحتیں کون اٹھائے۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ اور یہی ہوتا رہے گا۔ سلطنتوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں۔ جس طرح آدمی کوئی پیٹ میں، کوئی پیدا ہوتے ہی، کوئی بچپن میں، کوئی جوان ہو کر اور کوئی عمرِ طبعی طے کرنے کے بعد مرتا ہے، اسی طرح بادشاہتیں ہیں۔ کوئی ایک پُشت چلتی ہے، کوئی دو پشت۔ کسی کا سلسلہ سو پچاس ہی برس میں ٹوٹ جاتا ہے اور کسی کی عمارت صدیوں کی خبر لاتی ہے۔ مغلوں نے چھے سو برس تخت کو سنبھالا۔ آخر بڑھاپا تو سب ہی کو آتا ہے۔ ان کے کندھے بھی شل ہو گئے۔ دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔ آج اس کا توکل اس کا زمانہ ہے۔ موت اور زوال بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہمارے لیے عیش و عشرت ہی بہانہ ہو گئی۔

میں سمجھتا تھا کہ مرزا نرے شہزادے ہیں اور ان کی معلومات میں بازیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آج معلوم ہوا کہ قلعے والوں کا دماغ بگڑی میں بھی کتنا بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا "مرزا صاحب! یہ آپ نے کس فلسفی کا لکچر یاد کر لیا ہے۔ دو چار جملوں میں کیسے کیسے نکتے حل کر گئے۔" بولے، "پیارے ہمارے احوال پر نہ جاؤ۔ جان کر دیوانے بنے ہوئے ہیں۔ نہیں تو کیا نہیں جانتے کیا نہیں آتا

عالم میں اب تلک بھی مذکور ہے ہمارا
افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

❁❁❁

شعبہ گوشہ ادب

اگر میں کہوں کہ یہ تبصَرہ نہیں تبصِرہ ہوتا ہے تو؟

تحریر: اطہر ہاشمی

اعجاز رحمانی مرحوم بہت اچھے شاعر ہی نہیں تھے، زبان پر بھی بھرپور عبور تھا۔ ایک مشاعرے میں وہ بڑے اصرار سے 'تبصرہ' کہہ رہے تھے، یعنی تیسرا حرف بالکسر (تبصِرہ)۔ انہوں نے بار بار یہ لفظ دوہرایا، اور مزے کی بات یہ ہے کہ جو حضرات بڑھ چڑھ کر داد دے رہے تھے، خاص طور پر معلن، وہ مصرع اٹھاتے ہوئے 'تبصَرہ' یعنی 'ص' پر زبر کہہ رہے تھے (بروزن تذکرہ)۔ استاد کے منہ سے 'تبصِرہ' سن کر لغت دیکھنے کا خیال آیا کیونکہ ہم بھی تبصَرہ ہی کہتے تھے۔ لغت میں وہی ہے جو اعجاز رحمانی کہہ رہے تھے۔ عام طور پر لوگوں کے منہ سے تبصَرہ، تیسرے حرف پر زبر ہی سنا ہے۔

اب ہماری اصلاح تو ہوگئی، لیکن دوسرے بھی اپنی اصلاح کریں گے، اس کی ضمانت نہیں۔

ہم کب سے کوشش کررہے ہیں کہ 'دیہاڑی' میں سے 'ی' نکل جائے کہ یہ لفظ 'دہاڑی' اور 'دن دہاڑے' ہے۔ مگر پیر 30 مارچ کے جسارت ہی میں جلی سرخیوں میں 'دیہاڑی دار' شائع ہوا ہے۔ اس پر کس کا سر پیٹیں، اپنا ہی دستیاب ہے۔

اسی طرح 'چیئر مین' کی جمع 'چیئر مینز' نظر سے گزری۔ یہ نامعقول انگریزی زبان ہے۔ اس میں Man کی جمع Men ہے جو اردو میں 'مین' ہی لکھی جائے گی۔ لوگ مین ہول کو بھی Mane ہول سمجھتے ہیں، جب کہ یہ Man ہول ہے یعنی جس میں سے انسان گزر جائے۔ یہ مین ہول عام طور پر گٹر وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اب کسی کو کیا پڑی کہ اس میں سے گزرے، مجبوری کی بات اور ہے۔

اخبارات میں ایک اصطلاح بہت عام ہے 'ناجائز منافع خوری'۔ منافع حاصل کرنا بالکل جائز ہے، لیکن جب 'منافع خوری' کہا جائے تو اس میں ناجائز کا پہلو شامل ہوجاتا ہے، چنانچہ 'ناجائز' کا سابقہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح 'ناجائز تجاوزات' ہیں۔ تجاوز کا مطلب ہے حد سے آگے بڑھنا۔ کسی بھی معاملے میں حد سے آگے بڑھنا جائز نہیں، چنانچہ ناجائز تجاوزات میں بھی 'ناجائز' جائز نہیں۔ کراچی سے ملک محمد اعظم نے پوچھا ہے کہ یہ خلیل خان کون تھے جو فاختہ اڑاتے تھے۔ ان کے بارے میں ایک محاورہ ہے کہ وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ اڑاتے تھے۔ 'اردو محاورات کا تنقیدی مطالعہ' میں ہے کہ 'فاختہ پالا نہیں جاتا (یا پالی نہیں جاتی)'، کبوتر اڑانے کا رواج عام ہے لیکن فاختہ کوئی نہیں اڑاتا۔

خلیل خان ایک فرضی کردار ہے جو حماقت کی باتیں کرتے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ فاختہ اڑاتے تھے۔ گویا فاختہ اڑانا بے وقوفی کا عمل ہے اور محاورے میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح کے محاورے خاص کرداروں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ 'نوراللغات' میں فاختہ اڑانے کا مطلب ہے نکمے کام کرنا، عیش کرنا۔ جب کہا جائے کہ وہ دن گئے جب خلیل خان فاختہ اڑاتے تھے، تو اس کا مطلب ہے کہ عیش و عشرت کے دن گزر گئے۔ لغت کے مطابق فاختہ مونث ہے، عربی میں یہ 'فاختِہ' بکسر سوم تھا۔ اردو، فارسی میں فاختہ بسکون سوم ہے (فاخ۔ تہ)۔ اس کی گردن میں طوق ہوتا ہے جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے 'فاختہ طوق گلوگیر لیے پھرتی ہے'۔ الطاف نام کے ایک صاحب ایک اخبار میں اپنا سفر نامہ لکھ رہے ہیں جو یقیناً دلچسپ ہے۔ تاہم گزشتہ دنوں انہوں نے عرب ملکوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہاں سرکاری اعمال ٹالنے کے لیے 'بُقرہ' کہہ دیتے ہیں جس کا مطلب ہے کل آئندہ۔ انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ یہ لفظ 'بقرہ' نہیں 'بُکرہ' ہے۔ عربوں کے دفاتر میں یہ بکرہ بڑے کام کا لفظ ہے۔ سعودی عرب میں مقیم غیر عربوں میں اس حوالے سے IBM کی اصطلاح مشہور ہے یعنی 'ان شا اللہ، بکرہ، معافی'۔ یہ تینوں الفاظ سائل کو ٹالنے میں کام آتے ہیں۔ ویسے تو عربی میں کل آئندہ کو 'رغد' کہتے ہیں، لیکن زبانوں پر بُکرہ ہے جس کے اور بھی کئی مطلب ہیں۔

آیئے، تھوڑا سا اپنے ہی گریبان میں جھانکتے ہیں۔ سنڈے میگزین (29 مارچ تا 4 اپریل) میں گھروں میں رہنے کا مشورہ دینے والے مضمون نگار کا جملہ ہے 'صلواۃ کمیٹیاں بنائیں گئیں تھیں'۔ اس جملے کے بارے میں کیا کہیں۔ کم از کم اتنا تو خیال کریں کہ دو جمع یعنی 'بنائیں گئیں' ایک ساتھ نہیں آتی۔ اور پھر جب جمع ہے تو 'تھی' نہیں آئے گا۔ سیدھا سا جملہ ہے کہ 'بنائی گئی تھیں'۔ اس طرح لکھنے میں کیا قباحت ہے۔ ایک عرصے کی مضمون نگاری

کے بعد اب اردو آجانی چاہیے۔ ایک چھوٹے سے جملے میں انشاء کی دو دو غلطیاں!

اسی میگزین میں ایک اور جملہ ہے 'اہل کراچی ساحل کا رخ کر لیتی ہے'۔ واہ کیا بات ہے۔ اب تک تو عوام کو مونث بنایا جا رہا تھا، اب اہل بھی مونث ہو گئے۔ یہ کس کی نااہلی ہے؟ 'اہل' عربی کا لفظ ہے اور صاحب کے معنوں میں آتا ہے جیسے اہلِ علم، اہلِ کراچی۔ ان معنوں میں جمع کے لیے مخصوص ہے۔ یہ نہ کہیں گے کہ فلاں شخص اہلِ قلم ہے یا اہلِ علم ہے، بلکہ کہیں گے کہ اہلِ قلم میں سے ہے۔ کسی کو اہلِ علم لکھنے کی غلطی ہم سے بھی ہو چکی ہے جس کی اصلاح ایک قاری نے ترنت کر دی تھی۔ اہل کا مطلب ہے لائق، مناسبت اور صلاحیت رکھنے والا جیسے 'جو شخص جس چیز کا اہل ہی نہ ہو وہ اس کی قدر کیا کرے'۔ اہل کا معنیٰ خلیق و شایستہ بھی ہے۔ اہل اللہ کی ترکیب تو اردو میں عام ہے۔ اسی طرح اہلِ باطن، اہلِ بیت، اہلِ خانہ، اہلِ دل۔ اب تک کوئی شعر نہیں آیا اس لیے برداشت کریں:۔

ہر اک اپنے پہلو میں سمجھا ہے اس کو
سبھی اہلِ دل ہیں مگر دل یہی ہے

اہلِ زبان کے بارے میں حفیظ جالندھری نے کہا ہے

اہلِ زباں تو ہیں بہت کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

اخبارات میں ایک اور غلطی عام ہوتی جا رہی ہے اور وہ ہے 'آئمہ'۔ پیر کے کچھ اخبارات میں ائمہ مساجد کے حوالے سے یہ آئمہ شائع ہوا ہے۔ ائمہ کے الف پر مد نہیں ہے اور یہ امام کی جمع ہے۔ آمام کی نہیں۔ اب نہ تو ہمارے صحافی بھائی غلطیاں کرنے سے باز آتے ہیں اور نہ ہم تصحیح کرنے سے۔

ایک اور دلچسپ جملہ نظر آتا ہے 'کام کا طریقہ کار'۔ جملہ بظاہر صحیح ہے لیکن کبھی 'کار' پر غور کر کے دیکھیں، اس کا مطلب بھی تو کام ہے۔ اگر صرف 'کام کا طریقہ' لکھ دیا جائے تو بات بن جائے گی۔

23 مارچ کے اخبار میں جناب انور شعور کا قطعہ ہے جس کا ایک شعر ہے

لوگ ہیں اپنے گھروں میں بند
ہے کورونا بھی نیب کے مانند

انور شعور بھی ان شاعروں میں سے ہیں جن کو زبان پر عبور ہے۔ مذکورہ شعر میں انہوں نے 'مانند' کا قافیہ بند باندھا ہے اور یہی صحیح ہے، گو کہ لوگوں کی زبان پر مانند کا تیسرا حرف بالکسر ہے جب کہ یہ کسی کی نند کے وزن پر ہے اور مذکر ہے۔ یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ 'پرند' بھی مانند کے وزن پر ہے یعنی دوسرا حرف بالفتح ہے گو کہ ہم لوگ را کے نیچے زیر لگا کر پرندہ اڑاتے ہیں۔ پنجابی کا پراندہ بھی شاید پرندے سے ہو کہ یہ بھی چٹیا کے ساتھ اڑتا ہے۔

یہ مضمون ابتدائی طور پر فرائیڈے اسپیشل میں شائع ہوا اور باجازت یہاں شائع کیا گیا ہے۔

اطہر ہاشمی روزنامہ جسارت کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔ گزشتہ چار دہائیوں سے شعبۂ صحافت سے منسلک ہیں اور زبان و بیان پر گہری گرفت رکھتے ہیں۔

باپ کی شہادت کے 22 سال بعد بیٹا پاک فضائیہ میں شامل پاک فضائیہ کے اسکواڈرن لیڈر شہید محمد ندیم قاسمی کی جگہ 22 سال بعد ان کے بیٹے نے لے لی۔

22 ستمبر 1977 کو محمد ندیم قاسمی نے جام شہادت اس وقت نوش کیا جب ان کے طیارے کو رن وے پر حادثہ پیش آیا۔

سرحدوں کا دفع کرنے والے محمد ندیم قاسمی کی شہادت کے وقت ان کے بیٹے انزہ ندیم قاسمی کی عمر 3 برس تھی۔

اب انزہ ندیم بطور فلائٹ لیفٹیننٹ پاک فضائیہ میں اسی اسکواڈرن کا حصہ ہیں جس میں ان کے والد اپنی خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔

عورت کہانی

تحریر: ڈاکٹر مبشر احمد طاہر

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ارشادفرمایا”جوعورت اس حالت میں فوت ہوئی کہ اس کا خاونداس سے خوش اور راضی ہے تو وہ جنت میں جائے گی“ ۔ایک دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ارشادفرمایا”کسی عورت سے نکاح کرنے کی چار ہی بنیادیں ہوسکتی ہیں یاتواس کے مال کی وجہ سے یااس کے خاندان کی وجہ سے یااس کےحسن وجمال کی وجہ سے یااس کی دینداری کی وجہ سے لیکن تو دین دارعورت کوترجیح دے اللہ تیرا بھلا کرے اور تجھے دین دارعورت حاصل ہو“۔آج ہم آپ کوسات قسم کی عورتوں کی کہانی سنائیں گے وہ عورتیں جن سے شادی نہ کرنے کا کہا گیا ہے پہلی وہ عورت جس کا ذکر ہے وہ عورت قنانہ ہے قنانہ یعنی وہ عورت جو ہمیشہ پیچھے کی طرف یعنی اپنے ماضی کو یاد کرتی رہے کہ فلاں وقت میرے ساتھ یہ ہوا تھا وہ ہوا تھا فلاں وقت میں میرے والدین کے گھر میں تو یوں ہوتا تھالیکن تمھارے گھر میں کچھ بھی نہیں ہوتا مجھے اپنے گھر میں یہ سہولت میسر آئی تھی مگر اب تمہارے گھر میں ایسی سہولیات نہیں ہیں تمھارے پاس آ کر رل گئی ہوں برباد ہوگئی ہوں ایسی عورتوں کوقنانہ کا لقب دیا گیا ہے جواپنے حال میں جینے کی بجائے اپنے ماضی میں جیتی رہیں اس کو اپنا ماضی زیادہ پسند ہو اور اپنے خاوند کو ہروقت طعنہ دیتی رہے یہ وہ عورتیں ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہم اکثر بھائی ایک دوسرے کے ساتھ شکایت کرتے ہیں جو میری شریکِ حیات ہے وہ یونہی طعنہ دیتی ہے کہ شادی سے پہلے تم ایسے تھے مگر شادی کے فوراً بعد بدل گئے ہو چنانچہ اسی لئے کسی عرب دانا نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی کہ قنانہ عورت سے کبھی بھی شادی نہ کرنا خواہ وہ حسن وجمال میں لاجواب ہو حور پری ہو یا مال ودولت میں بے مثال ہو۔

دوسری عورت جس سے شادی نہ کرنے کا کہا گیا ہے وہ عورت شداقہ ہے شداقہ وہ عورت ہے جو تیز زبان ہو اور ہروقت باتیں بنانا جانتی ہو اور تو اور اس کا کام ہی باتیں بنانا ہو یہ تو Common Sense کی بات ہے اگر کوئی بھی تیز زبان شخصیت ہو اس میں صبر وتحمل کا مادہ نہیں ہوتا اور وہ ہروقت آپ پر طعنے اور طنز کے نشتر چلاتی رہے گی اور اس طرح آپ کی زندگی کو جہنم بنادے گی اور آپ اس تیز زبان عورت کے منہ سے اپنے لیئے کچھ چند محبت کے دو بول سننے کو ترس جائیں گے ایسی عورت سے اس عرب دانا نے شادی کرنے سے اپنے بیٹوں کو منع فرمایا۔

تیسری وہ عورت جس سے شادی نہ کرنے کا کہا گیا ہے وہ عورت عنایہ ہے عنایہ وہ عورت ہے جو ہر وقت اپنے سر پر پٹی باندھے رکھے یعنی ہر وقت وہ شکوہ شکایت کے ہی موڈ میں ہو اور ہمیشہ اس کا مزاج بگڑا ہی رہے اور یہی اس کی روٹین بن جائے کہ وہ سراپہ شکایت بنی رہتی ہے اور ہر بات میں میخ نکالتی اور کیڑے نکالتی ہے اور ہروقت اپنے سر پر پٹی باندھے رکھتی ہے کیونکہ اس کا کام ہی ہر بات پر جھگڑا کرنا اور بات کا بتنگڑ بنانا ہے کبھی وہ ساس کی شکایت کرتی ہوئی نظر آئے گی کبھی یہ عورت اپنی نند کی شکایت کرتے ہوئے نظر آئے گی اور کبھی اس بات پر کہ آپ نے میرے لیے کیا کیا ہے کبھی میرا خیال نہیں کیا کہ میں بھی اس دنیا میں رہتی ہوں بس اس کو سوائے بات سے بات نکال کر جھگڑا کرنا ہے اور کوئی کام نہیں اس عورت کے بارے میں عرب دانا نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ ایسی عورت سے شادی نہ کرنا۔

چوتھی عورت جس سے نکاح کرنے سے اس عرب دانا نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی کہ اس عورت سے شادی نہ کرنا وہ عورت حنانہ کا لقب دیا گیا ہے یہ عورت حنانہ یعنی وہ عورت ہے جو ہر وقت اپنے سابقہ شوہر کو ہی یاد کرتی رہے اور اسی Comparison کی بیماری میں مبتلا رہے اور یہی کہتی رہے کہ میرا سابقہ شوہر تو بہت اچھا تھا لیکن تم تو ویسے ہرگز نہیں ہو وہ تو میرا بہت خیال رکھتا تھا مجھے تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی مگر یہاں تمہارے ساتھ شادی کرنے کے بعد تو میری حیثیت ایک نوکرانی جیسی ہوگئی ہے بلکہ اس سے بھی کم تر ہے ایسی عورت کو

حنانہ کہا گیا ہے اس سے بھی شادی کے عمل سے دور رہنا چاہئے ورنہ آپ کی ساری زندگی جو ہے وہ ایک عذاب کی صورت اختیار کر جائے گی یا پھر ایک سزا کی صورت میں گزرنے کا امکان ہے۔ان سات عورتوں میں پانچویں نمبر پر جس عورت کا ذکر کیا گیا ہے وہ منانہ کہلاتی ہے منانہ وہ عورت ہے جو ہر وقت مرد پر احسان جتاتی رہتی ہے کہ میں نے تیرے لیے یہ کیا ہے میں نے تیرے لیے وہ کیا ہے میں نے تجھ پر یہ احسان کیا ہے لیکن تو نے میرے لیے کیا کیا تو نے میرے لیے کچھ بھی نہیں کیا ہے میں نے کس کس طرح مدد کی لیکن پھر بھی مجھے تجھ سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا اس عرب دانا نے اپنے بیٹوں سے اس جیسی عورت سے شادی نہ کرنے کی نصیحت کی کیونکہ ایسی عورتوں کی کم ظرفی کی نشانی ہوتی ہے اور کوئی بھی شخص اپنی ساری زندگی کسی ایسی عورت کے ساتھ نہیں گزار سکتا اور نہ ہی گزارنا پسند کرے گا جو کم ظرف عورت ہوتی ہے وہ مرد پر ہر بات بات پر احسان ڈال کر شرمندہ کرنے والی ہوتی ہے ایک بزرگ صوفی شاعر نے کیا خوب کہا جس کا مفہوم یہ ہے

بڑوں سے محمد بخش فیض کسے نہ پایا
ککر پر انگور چھڑ بابا ہر خوشہ زخمایا

اس لیے اس عورت کو منانا کہا گیا اس عورت سے شادی کرنے والا اپنی ساری زندگی پچھتاوے میں گزارے گا کیونکہ اس کا مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ ذرا سی مہربانی کرنے کے بعد آپ کو مسلسل اس احسان کو جتلاتی رہے گی۔

اس کے بعد جس چھٹی عورت کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ وہ عورت ہے جس کے بارے میں اس عرب دانا نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے شادی نہ کرنا یہ عورت حداقہ کہلاتی ہے یعنی وہ عورت جو ہر وقت فرمائشیں کرتی رہتی ہے یعنی کچھ بھی دیکھے تو اس کی طلبگار بن جائے گی مجھے پہلے دو مجھے وہ لے دو مجھے یہ چاہیئے مجھے وہ چاہیئے میں نے تو یہ خریدنا ہے میں نے تو وہ خریدنا تھا فلاں نے خرید لیا ہے میں نے بھی خریدنا تھا مجھے وہ بہت پسند تھا اب جیسے بھی ہو وہ خرید کر لا دیں یہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہروں کو مالی مشکلات کا معاشی مسائل کا شکار کر دیتی ہیں ان کو اس چیز کی غرض نہیں ہوتی کہ وہ پیسہ کہاں سے آئے گا اور کیسے آئے گا اور پھر ایسی ہی Situation سے بہت ساری دیگر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں جیسا کہ کرپشن اور اقربا پروری جیسی دیگر برائیاں اگر آپ کو یہ محسوس ہو کہ آپ کے سامنے والی جو عورت ہے وہ حداقہ کی Category میں یعنی اس Category میں ہے جیسے ہر وقت فرمائش کرتی رہتی ہے تو اس سے شادی نہ کریں کیونکہ اس سے شادی کرنے سے آپ قرض جیسی بری لعنت میں بھی گھر جائیں گے۔

اب ان سات قسم کی عورتوں کی کہانی میں ساتویں نمبر پر جس عورت کا ذکر کیا گیا ہے اس عورت کے بارے میں اس عرب دانا نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ کوئی اس سے شادی نہ کرے اس عورت کو براقہ کا نام دیا گیا ہے براقہ لفظ دراصل برق سے نکلا ہے جس کے معانی چمک دمک کے ہیں اور براقہ وہ عورت ہے جو ہر وقت اپنی چمک دمک میں لگی رہتی ہے یعنی اپنے بناؤ سنگھار میں لگی رہتی ہے اور اس کو اپنے گھر کا اپنے گھر کے اہل وعیال کا اور اپنے خاوند کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کس حال میں ہیں ایسی عورت سے اگر کوئی شخص شادی کر لیتا ہے تو وہ اپنی گھریلو زندگی میں خوش نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اس کی زندگی میں کوئی خوشی اور آسائش آ سکتی ہے کیونکہ وہ پہلے ہی بے نیازی کی کیفیت میں ہے وہ پہلے ہی پرواہ نہ کرنے والی ہے اس کو صرف اور صرف اپنا آپ نظر آتا ہے تو پھر وہ آپ کے لیے کیا کرے گی اس لیے ایسی عورت سے شادی کرنے کے بعد وہ شخص پچھتاوے کی زندگی گزارے گا۔

دوستو یہ وہ سات قسم کی عورتیں ہیں جن سے شادی کر کے آپ خوش نصیب نہیں بن سکتے اگر آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث شریف کے مطابق کسی دین دار عورت سے شادی کریں گے تو آپ کی زندگی خوشیوں سے بھری پڑی ہوگی اور آپ کی اولاد بھی نیک اور اطاعت گزار اور خدمت گزار ہوگی۔

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔
ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ
تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق
اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

گھاٹے کے سوداگر

ہنری کا تعلق امریکہ کے شہر سیاٹل سے تھا وہ مائیکروسافٹ میں ایگزیکٹو منیجر تھا۔ اس نے 1980ء میں جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کیا اور اس کے بعد مختلف کمپنیوں سے ہوتا ہوا مائیکروسافٹ پہنچ گیا' مائیکروسافٹ اس کے کیریئر میں ''ہیلی پیڈ'' ثابت ہوئی اور وہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا' وہ 1995ء میں کمپنی میں بھاری معاوضہ لینے والے لوگوں میں شمار ہوتا تھا اور اس کے بارے میں کہا جاتا تھا جب تک ہنری کسی سافٹ ویئر کو مسکرا کر نہ دیکھ لے مائیکروسافٹ اس وقت تک اسے مارکیٹ نہیں کرتی' ہنری نے کمپنی میں یہ پوزیشن بڑی محنت اور جدوجہد سے حاصل کی تھی۔

وہ دفتر میں روزانہ 16 گھنٹے کام کرتا تھا' وہ صبح 8 بجے دفتر آتا تھا اور رات بارہ بجے گھر جاتا تھا' ہنری کا ایک ہی بیٹا تھا' ہنری دفتری مصروفیات کے باعث اپنے بیٹے کو زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا' وہ جب صبح اٹھتا تھا تو اس کا بیٹا سکول جا چکا ہوتا تھا اور وہ جب دفتر سے لوٹتا تھا تو بیٹا سو رہا ہوتا تھا' چھٹی کے دن اس کا بیٹا کھیلنے کے لئے نکل جاتا تھا جبکہ ہنری سارا دن سوتا رہتا تھا۔ 1998ء میں سیاٹل کے ایک ٹیلی ویژن چینل نے ہنری کا انٹرویو نشر کیا' اس انٹرویو میں ٹیلی ویژن کے میزبان نے اعلان کیا آج ''ہمارے ساتھ سیاٹل میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی شخصیت بیٹھی ہے'' کیمرہ میزبان سے ہنری پر گیا اور ہنری نے فخر سے مسکرا کر دیکھا' اس کے بعد انٹرویو شروع ہو گیا' اس انٹرویو میں ہنری نے انکشاف کیا وہ مائیکروسافٹ سے 500 ڈالر فی گھنٹہ لیتا ہے۔ یہ انٹرویو ہنری کا بیٹا اور بیوی بھی دیکھ رہی تھی' انٹرویو ختم ہوا تو ہنری کا بیٹا اٹھا' اس نے اپنا ''منی باکس'' کھولا' اس میں سے تمام نوٹ اور سکے نکالے اور گننا شروع کر دیئے' یہ ساڑھے چار سو ڈالر تھے' ہنری کے بیٹے نے یہ رقم جیب میں ڈال لی' اس رات جب ہنری گھر واپس آیا تو اس کا بیٹا جاگ رہا تھا' بیٹے نے آگے بڑھ کر باپ کا بیگ اٹھایا' ہنری نے جھک کر بیٹے کو پیار کیا' بیٹے نے باپ کو صوفے پر بٹھایا اور بڑی عاجزی کے ساتھ عرض کیا' ''ڈیڈی کیا آپ مجھے پچاس ڈالر ادھار دے سکتے ہیں'' باپ مسکرایا اور جیب سے پچاس ڈالر نکال کر بولا'' کیوں نہیں' میں اپنے بیٹے کو ساری دولت دے سکتا ہوں'' بیٹے نے پچاس ڈالر کا نوٹ پکڑا' جیب سے ریزگاری اور نوٹ نکالے' پچاس کا نوٹ ان کے اوپر رکھا اور یہ ساری رقم باپ کے ہاتھ پر رکھ دی' ہنری حیرت سے بیٹے کو دیکھنے لگا' بیٹے نے باپ کی آنکھ میں آنکھ ڈالی اور مسکرا کر بولا'' یہ پانچ سو ڈالر ہیں' میں ان پانچ سو ڈالروں سے سیاٹل کے سب سے امیر ورکر سے ایک گھنٹہ خریدنا چاہتا ہوں'' ہنری خاموشی سے بیٹے کی طرف دیکھتا رہا' بیٹا بولا'' میں اپنے باپ سے صرف ایک گھنٹہ چاہتا ہوں' میں اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں' میں اسے چھونا چاہتا ہوں' میں اسے پیار کرنا چاہتا ہوں' میں اس کی آواز سننا چاہتا ہوں' میں اس کے ساتھ ہنسنا' کھیلنا اور بولنا چاہتا ہوں'

ڈیڈی کیا آپ مجھے ایک گھنٹے دے دیں گے' میں آپ کو اس کا پورا معاوضہ دے رہا ہوں'' ہنری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اس نے بیٹے کو گلے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ہنری نے 1999ء میں ''فیملی لائف'' کے نام سے ایک آرٹیکل لکھا' مجھے یہ مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا' اس مضمون میں اس نے انکشاف کیا دنیا میں سب سے قیمتی چیز خاندان ہوتا ہے' دنیا میں سب سے بڑی خوشی اور سب سے بڑا اطمینان ہماری بیوی اور بچے ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم لوگ انہیں سب سے کم وقت دیتے ہیں' ہنری کا کہنا تھا دنیا میں سب سے بڑی بے وفا چیز ہماری نوکری' ہمارا پیشہ اور ہمارا کاروبار ہوتا ہے' ہم آج بیمار ہو جائیں' آج ہمارا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو ہمارا ادارہ شام سے پہلے ہماری کرسی کسی دوسرے کے حوالے کر دے گا' ہم آج اپنی دکان بند کر دیں' ہمارے گاہک کل کسی دوسرے سٹور سے خریداری کر لیں گے' آج ہمارا انتقال ہو جائے تو کل ہمارا شعبہ' ہمارا پیشہ ہمیں فراموش کر دے گا لیکن بدقسمتی سے ہم لوگ دنیا کی سب سے بڑی بے وفا چیز کو زندگی کا سب سے قیمتی وقت دے دیتے ہیں' ہم اپنی بہترین توانائیاں اس بے وفا دنیا میں صرف کر دیتے ہیں اور وہ لوگ جو ہمارے دکھ درد کے ساتھی ہیں جن سے ہماری ساری خوشیاں اور ہماری ساری مسرتیں وابستہ ہیں

اور جو ہمارے ساتھ انتہائی وفادار ہوتے ہیں ہم انہیں فراموش کر دیتے ہیں' ہم انہیں اپنی زندگی کا انتہائی کم وقت دیتے ہیں۔''

ہنری کی کہانی نے مجھے زندگی کا ایک دوسرا پہلو دکھایا' مجھے محسوس ہوا ہماری زندگی میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں' ایک وہ لوگ جن کے لئے ہمارا وجود معمول کی چیز ہوتا ہے' جو ہمیں مشین کی طرح سمجھتے ہیں' جن کی نظر میں ہم محض ایک کارکن ہیں' جو ہمیں میز' کرسی' ٹیبل لیمپ' گاڑی' قلم' کاغذ' ٹشو پیپر' کھڑکی اور دروازے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور جو ہمارے بارے میں کہتے ہیں ''استعمال کرو' پھینکو اور بھول جاؤ'' جبکہ دوسری قسم کے لوگ ہمیں اپنے وجود' اپنی دھڑکنوں اور اپنی سانسوں کا حصہ سمجھتے ہیں' وہ ہمارے لئے تکلیف برداشت کرتے ہیں' وہ ہمارے لئے ظلم سہتے ہیں' وہ راتوں کو جاگ کر ہمارا انتظار کرتے ہیں' وہ ہمارے وعدوں کو آسمانی تحریر سمجھتے ہیں اور جن کی نظر میں ہمارا ایک ایک لفظ مقدس اور پاک ہوتا ہے اور جو ہمارے اصل ساتھی ہوتے ہیں' میں نے سوچا بدقسمتی سے ہم لوگ پہلی قسم کے لوگوں کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی حصہ دے دیتے ہیں' ہم لوگ زندگی بھر دوسری قسم کے لوگوں کو فراموش کر کے پہلی قسم کے لوگوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں' ہم بے وفا لوگوں سے وفاداری نبھاتے رہتے ہیں اور وفاداروں سے بے وفائی کرتے رہتے ہیں' میں نے کسی جگہ امریکہ کے ایک ریٹائر سرکاری افسر کے بارے میں ایک واقعہ پڑھا تھا

اس افسر کو وائٹ ہاؤس سے فون آیا کہ فلاں دن صدر آپ سے ملنا چاہتے ہیں' اس افسر نے فوراً معذرت کر لی' فون کرنے والے نے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا ''میں اس دن اپنی پوتی کے ساتھ چڑیا گھر جا رہا ہوں'' یہ جواب سن کر فون کرنے والے نے ترش لہجے میں کہا ''آپ چڑیا گھر کو صدر پر فوقیت دے رہے ہیں'' ریٹائر افسر نے نرمی سے جواب دیا ''نہیں میں اپنی پوتی کی خوشی کو صدر پر فوقیت دے رہا ہوں'' فون کرنے والے نے وضاحت چاہی تو ریٹائر افسر نے کہا ''مجھے یقین ہے میں جوں ہی وہائٹ ہاؤس سے باہر نکلوں گا تو صدر میرا نام اور میری شکل تک بھول جائے گا جبکہ میری پوتی اس سیر کو پوری زندگی یاد رکھے گی' میں گھاٹے کا سودا کیوں کروں' میں یہ وقت اس پوتی کو کیوں نہ دوں جو اس دن' اس وقت میری شکل اور میرے نام کو پوری زندگی یاد رکھے گی' جو مجھ سے محبت کرتی ہے' جو اس دن کیلئے گھڑیاں گن رہی ہے'' میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تو میں نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے دیر تک سوچتا رہا' ہم میں سے 99 فیصد لوگ زندگی بھر گھاٹے کا سودا کرتے ہیں' ہم لوگ ہمیشہ ان لوگوں کو اپنی زندگی کے قیمتی ترین لمحات دے دیتے ہیں جن کی نظر میں ہماری کوئی اوقات' ہماری کوئی اہمیت نہیں ہوتی' جن کیلئے ہم ہوں یا نہ ہوں کوئی فرق نہیں پڑتا' جو ہماری غیر موجودگی میں ہمارے جیسے کسی دوسرے شخص سے کام چلا لیتے ہیں' میں نے سوچا ہم اپنے سنگدل باس کو ہمیشہ اپنی اس بیوی پر فوقیت دیتے ہیں جو ہمارے لئے دروازہ کھولنے' ہمیں گرم کھانا کھلانے کے لئے دو' دو بجے تک جاگتی رہتی ہے' ہم اپنے بے وفا پیشے کو اپنے ان بچوں پر فوقیت دیتے ہیں جو مہینہ مہینہ ہمارے لمس' ہماری شفقت اور ہماری آواز کو ترستے ہیں' جو ہمیں صرف البموں اور تصویروں میں دیکھتے ہیں' جو ہمیں یاد کرتے کرتے بڑے ہو جاتے ہیں اور جو ہمارا انتظار کرتے کرتے جوان ہو جاتے ہیں لیکن انہیں ہمارا قرب نصیب نہیں ہوتا' ہم انہیں ان کا جائز وقت نہیں دیتے' میں نے سوچا' ہم سب گھاٹے کے سوداگر ہیں۔

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔

تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ کے وائس چانسلر پروفیسر راج کمار کا پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر ڈاکٹر نیاز احمد اختر کے نام خط

بائیس اپریل-2019ء

391-راجیشوری گارڈنز

مہاتما سکوائر

چندی گڑھ 160017

ریپبلک آف انڈیا

نیاز جی نمستے،

اگر علم مومن کی گمشدہ میراث ہوتا تو 1882ء میں قائم ہونیوالی آپ کی یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری میں پانچ لاکھ اور 1947ء میں قائم ہونیوالی میری یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری میں چونسٹھ لاکھ کتابوں کی موجودگی حقیقت کی جگہ فسانہ ہوتا اور چہار دانگ عالم آپ کے ادارے کا ڈنکا بجتا مگر چونکہ ایسا نہیں ہے لہذا راقم کف افسوس ہی مل سکتا ہے۔میری یونیورسٹی میں دائیں اور بائیں بازو کی طلباء تنظیمیں شعور اور منشور کے بل پر جمہوری اقدار کی نمو کرتی ہیں مگر آپ کی جانب سٹوڈنٹ پالیٹکس پہ ضیائی پابندی اور اسلامی جمعیت طلباء کی غنڈہ گردی نے وہ علم پرور ماحول پروان چڑھایا ہے جہاں لڑکے داڑھیوں میں برکت اور لڑکیاں عبایوں میں حرکت تلاش کرتی ہیں اور اس برکت کی حرکیات کے پس پردہ لاشعوری عوامل کی شعوری تشکیل آپ کی جامعہ جامعہ اشرفیہ کے تعاون کیساتھ کرتی ہے اور یونہی دیے سے دیا جلتا ہے۔میری یونیورسٹی میں فائن آرٹس میوزیم سمیت کل چار میوزیمز ہیں اور آپ کی پوری یونیورسٹی ہی ایک میوزیم ہے جس میں مٹی اور پسلی سے انسان کی تخلیق پہ ایمان رکھنے والے پی ایچ ڈی پروفیسرز لائف سائنسز کی تعلیم دے رہے ہوتے ہیں اور کسی بھی ڈگری کورس میں فلاسفی مائنز کا تصور اس لئے بھی محال ہے کیونکہ آپ طلباء کو انسان کی جگہ وہ مسلمان بنانا چاہتے ہیں جو نیوزی لینڈ حملوں کی تو مذمت کریں اور سری لنکا میں ایسٹر کے دن ہونیوالے حملوں میں ملوث التوحید جماعت کے بارے میں کہیں کہ ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔لیاقت بلوچ اور حافظ ادریس جیسے جماعتیوں نے قیصر شریف کے تعاون سے آج تک آپ کی یونیورسٹی میں میوزک کلاسز شروع نہیں ہونے دیں اور آپ وہ کلاسز مال روڈ کے الحمرا کلچرل کمپلیکس میں منعقد کرنے پہ مجبور ہیں اور اسی مذہبی شدت پسندی کے آگے سر اور پشت جھکانے کا منطقی نتیجہ ہے کہ آج آپ کی یونیورسٹی کی رینکنگ مراکز لواطت مدارس کی صف میں ہوتی ہے۔میری یونیورسٹی نے کلپنا چاولہ جیسی ناسا ایسٹروناٹ، رومیلا تھاپر جیسی مؤرخ اور ترن تیجپال جیسے تہلکہ کے بانی صحافی پیدا کیئے ہیں اور آپ کی یونیورسٹی مشعال خان کی موت پر جشن منانے والے انسان نما حیوان پیدا کرتی ہے۔آپ کی حکومت شیخ چلی نیشنل ایکشن پلان کا دھیمی آنچ پہ خیالی پلاؤ پکا رہی ہے اور آپ کے یونیورسٹی ہاسٹلز میں جمعیت کے عقوبت خانوں میں اسلحہ، ڈنڈے، استریاں اور مودودی کے پمفلٹس اس پلاؤ کو سر راہ اڑتے امن کے کبوتروں کو چاول سمجھ کر ڈال رہے ہیں جنھیں کھانے کے بعد امن کے کبوتروں کی بڑی تعداد داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکی ہے۔آپ کی یونیورسٹی کے پینتالیس ہزار طلباء میں سے 44950 طلباء کو ہرگوبند کھورانہ کا نام تک نہیں پتہ جس نے آپ کی یونیورسٹی سے 1943ء میں گریجوایشن کر کے 1968ء میں پروٹین میں پائے جانیوالے نیوکلیک ایسڈز میں نیوکلیوٹائیڈز کی ترتیب وضع کر کے میڈیسن کا نوبیل انعام جیتا مگر ان تمام پینتالیس ہزار طلباء کو یہ ضرور پتہ ہے کہ 1979ء میں گرینڈ یونیفیکیشن تھیوری پہ کام کر کے فزکس کا نوبیل انعام جیتنے والے ڈاکٹر عبدالسلام ایک قادیانی لہذا غیر مسلم تھے حالانکہ مسلمان خود عیسائیوں کے قادیانی ہیں۔لاہور اور پاکستان کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہو کر بھی آپ نے 1910ء میں لاہور میں پیدا ہونیوالے سبرامنین چندرشیکھر کے اعزاز میں کوئی چیئر قائم نہیں کی جنھوں نے 1983ء میں ستاروں کے ارتقاء اور ساخت پر کام کر کے فزکس کا نوبیل انعام جیتا تھا مگر آپ کا شعبۂ دائرہ معارف الاسلامیہ دن رات اس ٹوہ میں لگا رہتا ہے

که غارحرا سے پیغمبر اسلام جن جوتوں پہ چل کر خدیجہ کے گھر پہنچے تھے وہ پیغمبر کے پاؤں لگنے کے بعد امر ہو کر آج کل کہاں پائے جاتے ہیں۔جس یونیورسٹی میں طلباء کو بس یہ فکر ہو کہ پچھتر فیصد حاضری کے بغیر امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملے گی جنس مخالف سے بات کرنے کی صورت میں جماعتیے ہڈیوں کو روایتیں سمجھ کر توڑ دینگے، جہاں غیر مسلم اور ملحد طلباء کو بھی جبراً اسلامیات لازمی سے انٹرکورس کروایا جائے، جہاں 130 فٹ کی حوروں کے جسمانی نشیب وفراز کے دلال طارق جمیل یونیورسٹی طلباء سے خطاب کریں اور جہاں کنسرٹس کی جگہ محافل میلاد منعقد ہوں وہاں ایک سیکولر اور پروگریسو تعلیمی ماحول پنپ ہی نہیں سکتا اور یہی وجہ ہے کہ نیو کیمپس سے گزرنے والی نہر میں پانی بھی تحقیقی رجحان کی طرح کم ہو رہا ہے اور اب بس نہر کنارے لگا امجد اسلام امجد کا یہ شعر بیتے دنوں کی یاد دلاتا ہے کہ محبت ایسا دریا ہے کہ بارش روٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا۔امید ہے آپ اس خط کو دخل در نامعقولات تصور نہیں کرینگے اور چندی گڑھ آ کر یہاں کی پنجاب یونیورسٹی سے یہ سیکھنے میں تامل کا مظاہرہ بھی نہیں کرینگے کہ یونیورسٹی اور مدرسہ چلانے میں فرق کیا ہوتا ہے۔

خیراندیش پروفیسر راج کمار۔

عالمی ادارے مقبوضہ کشمیر میں صحافیوں پر قائم بے بنیاد مقدمات کا نوٹس لیں، راجہ نجابت حسین

بریڈفورڈ (محمد رجاسب مغل) جموں وکشمیر تحریک حق خودارادیت انٹرنیشنل کے چیئرمین راجہ نجابت حسین نے اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں سے اپیل کی ہے کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی ہتھکنڈوں اور میڈیا کو دبانے کیلئے صحافیوں پر قائم بے بنیاد مقدمات کا نوٹس لیں، دنیا بھر میں اظہار رائے کی آزادی اور آزاد میڈیا کے لئے آواز اٹھانے والوں کو مقبوضہ کشمیر میں مودی حکومت کی دہشت گردی اور میڈیا پر قدغن لگانے پر بھی آواز اٹھانی چاہیے، معروف کشمیری رہنما و چیئرمین تحریک حق خودارادیت انٹرنیشنل راجہ نجابت حسین نے برطانیہ سے میڈیا کے نام جاری بیان میں کہا کہ دنیا کو ایک طرف کورونا کی وبا کا سامنا ہے اور دنیا بھر میں غیر معمولی حالات ہیں تو دوسری جانب بھارت میں انتہا پسند ہندو مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کا جینا حرام کئے ہوئے ہیں، مقبوضہ کشمیر میں بدترین تشدد کی لہر جاری ہے، کالے قوانین کے تحت میڈیا کی آواز دبانے کے لیے صحافیوں پر بے بنیاد مقدمات بنائے جا رہے ہیں اور انہیں گرفتار کیا جا رہا ہے، اس سے قبل حریت وسیاسی قائدین، خواتین رہنماؤں، نوجوانوں اور متحرک سماجی کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر رکھا ہے، اب میڈیا سے منسلک افراد کو گرفتار کر کے ان کے خلاف بدنام زمانہ کالے قوانین کے تحت مقدمات بنائے جا رہے ہیں- راجہ نجابت حسین نے مزید کہا کہ نام نہاد جمہوریت بھارت پر مسلط دہشت گرد مودی کی حکومت نے تمام تر جمہوری، انسانی اور اخلاقی اقدار کو روند ڈالا ہے، اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں، انسانی حقوق کمیشن کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ فوری طور پر نوٹس لیتے ہوئے بھارت کے اس ظلم وتشدد کو روکنے کیلئے موثر اقدامات اٹھائیں، راجہ نجابت حسین نے کہا کہ اس وقت بھارت پر انتہا پسند ہندوؤں کا قبضہ ہے جو اقلیتوں کا جینا حرام کئے ہوئے ہیں اور انہیں ہر طرح کے دنگے فساد کی بھی کھلی آزادی ہے، بلکہ حکومتی سرپرستی میں کشمیر میں اور بھارت کے اندر نسل کشی کی بدترین کاروائیاں جاری ہیں، کشمیر میں کرفیو اور لاک ڈاؤن کر کے کشمیریوں کی نقل وحرکت پر پابندی لگائی گئی پھر بھارتی فورسز اور انتہا پسند آر ایس ایس کے غنڈوں کو نسل کشی کی کھلی چھٹی دی گئی۔

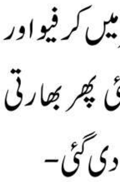

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے

ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

(علامہ اقبال)

برطانوی جاسوسوں کو خطرات سے نمٹنے کیلئے آرٹیفیشل انٹیلی جنس کی ضرورت ہوگی

لندن (پی اے) ایک انٹیلی جنس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جی سی ایچ کیو کے احکامات پر تیار کی گئی رپورٹ، جس تک بیشتر انٹیلی جنس کمیونٹی کی رسائی تھی، برطانوی جاسوسوں کو مختلف خطرات سے نمٹنے کیلئے آرٹیفیشل انٹیلی جنس (اے آئی) کے استعمال کی ضرورت ہوگی۔ مخالفین ممکنہ طور پر اس ٹیکنالوجی کو سائبر سپیس اور سیاسی نظام پر حملوں کیلئے استعمال کر سکتے ہیں، ایسے حملوں کا سراغ لگانے اور انہیں روکنے کیلئے اے آئی کی ضرورت پیش آئے گی۔ تاہم رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اے آئی کے ذریعے اس بات کی پیشگوئی کرنا مشکل ہوگا کہ ان حملوں مثلاً دہشتگردی میں کون ملوث ہے اور انسانی فیصلوں کو تبدیل نہیں کیا جا سکے گا۔ رپورٹ برٹش انٹیلی جنس تک بے مثال رسائی کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے۔ تھنک ٹینک رائل یونائیٹڈ سروسز انسٹی ٹیوٹ (آر یو ایس آئی) نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ مصنوعی ذہانت کے استعمال سے نئی پرائیویسی اور انسانی حقوق پر غور کا موقع حاصل ہو سکے گا، جس کیلئے نئی گائیڈ لائن کی ضرورت ہوگی۔ RUSI نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ بلا شبہ برطانوی مخالفین اے آئی استعمال کرتے ہوئے برطانیہ پر حملے کرنا چاہیں گے جس میں صرف ریاستیں ہی نہیں بلکہ کرمنلز بھی ملوث ہو سکتے ہیں۔ رپورٹ میں دلیل دی گئی ہے کہ اے آئی کا مقابلہ اے آئی کے ذریعے ہی ہو سکے گا۔ اے آئی کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو صرف گنجائش سے زیادہ انفارمیشن سے نمٹنے کیلئے ہی ضرورت نہیں پیش آئے گی بلکہ مصنوعی ذہانت استعمال کرتے ہوئے برطانیہ پر ہونے والے حملوں سے نمٹنے کیلئے بھی مصنوعی ذہانت کی ضرورت ہوگی۔ تھنک ٹینک کے ایک مصنف الیگزینڈر بابوٹا نے کہا ہے کہ اس امر کے امکانات بہت زیادہ ہیں کہ بدنیتی پر مبنی اداکار برطانیہ پر مختلف طریقوں سے حملے کریں، ایسی صورت میں انٹیلی جنس کمیونٹی کو مصنوعی ذہانت کی بنیاد پر دفاعی اقدامات کی ضرورت ہوگی۔

بل گیٹس کا چین کے حق میں بیان، امریکا کو آڑے ہاتھوں لے لیا

مائیکروسافٹ کے سربراہ بل گیٹس چین کے حق میں سامنے آگئے اور بیجنگ کے خلاف وائرس پھیلانے کے پروپگینڈے کو غیر منصفانہ قرار دے دیا۔

غیر ملکی خبر رساں ادارے کو ویڈیو لنک کے ذریعے انٹرویو دیتے ہوئے بل گیٹس کا کہنا ہے کہ چین پر کورونا وائرس کے پھیلاؤ کا الزام عائد کرنا قبل از وقت ہوسکتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ جھوٹ ہونے کے ساتھ ساتھ غیر منصفانہ بھی ہے کیونکہ ایسا کرنے سے چین کی کورونا وائرس کے خلاف کوششوں میں خلل پیدا ہوسکتا ہے۔ سی این این کو ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ چین نے ابتدا سے ہی کورونا وائرس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے درست اقدامات کیے ہیں۔

بل گیٹس نے امریکی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا کہ امریکا کا کووڈ 19 جیسی وبا سے نمٹنے کے لیے ردعمل بہتر نہیں تھا۔

مائیکروسافٹ کے شریک بانی کا کہنا تھا کہ آپ جانتے ہیں کہ کچھ ممالک نے کورونا وائرس پر بہت تیز ردعمل دیا، اور ٹیسٹنگ کے عمل کو موثر بنایا اور معیشت پر پڑنے والے برے اثر کو برداشت کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ بہت دکھ کی بات ہے کہ امریکا، جسے ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ اس وبا کے خلاف فوری ردعمل دے گا، لیکن اس نے بہت برے انداز میں اس کو لیا، تاہم اب یہ وقت ایسے باتیں کرنے کا نہیں ہے۔' اپنے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے بل گیٹس کا کہنا تھا کہ ہمیں اپنی سائنس کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے، ٹیسٹ کٹکس کو ٹھیک کرنے کی، علاج لانے اور ادویات بنانے کی ضرورت ہے۔

بل گیٹس نے کہا کہ بہت سی چیزیں غلط ہوگئی ہیں جن پر ابھی بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ واضح رہے کہ کچھ روز قبل امریکی خفیہ ادارے کے اہلکار نے کہا تھا کہ امریکی ادارے اس بات کی تحقیق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کیا یہ وائرس ووہان کی لیب سے نکل کر دنیا میں پھیلا ہے یا پھر اس کے محرکات کچھ اور ہیں۔

امریکا میں اس وائرس کے پھیلاؤ کے ابتدا میں بھی امریکا نے چین کو وائرس کے پھیلانے پر موردِ الزام ٹھہرایا تھا تاہم چینی حکام امریکا کے اس الزام کو بے بنیاد قرار دے کر مسترد کر چکے ہیں۔